جاری کردہ
سید ابو الاعلیٰ مودودیؒ

ماہنامہ
ترجمان القرآن

اکتوبر ۱۹۹۹

مُدیر
پروفیسر خورشید احمد

ادارہ ترجمان القرآن



آپ کے قابل اعتماد معاون قاضی انٹرپرائزز کا مری میں دو کامیاب منصوبوں کے بعد تیسرا شاندار منصوبہ
اسلام آباد ، راولپنڈی اور مری میں آٹھ کامیاب منصوبوں کے بعد اکیسویں صدی کے تقاضوں کے عین مطابق جدید سہولیات سے آراستہ جزوقتی حقوق ملکیت کا ایک نیا اور منفرد منصوبہ انتہائی آسان اقساط
تین سال میں اصل رقم واپس اور منافع دوگنا
پہلے 15 خوش نصیبوں کے لئے 5% فیصد رعایت
ٹائم شیئرنگ مری
فیملی اپارٹمنٹ
نقد ادائیگی
کی صورت میں 5% فیصد رعایت یا فوری رہائش
ایک ہزار کا بنک ڈرافٹ بنام قاضی انٹرپرائزز اکاؤنٹ نمبر ۱۱۳۳۳ الائیڈ بنک راشد منہاس روڈ راولپنڈی بنا کر ہیڈ آفس روانہ کریں اور اپنی بکنگ کنفرم کریں
وی آئی پی اپارٹمنٹ
2 بیڈروم 2 باتھ ڈرائنگ روم کچن ویوگیلری
ایگزیکٹو اپارٹمنٹ
2 بیڈروم 2 باتھ کچن ویوگیلری
مزید سہولیات:
پُرآسائش بیڈروم آرام دہ فرنیچر، رنگین Tv، ڈش انٹینا ٹیلی فون۔ کار پارکنگ مستعد عملہ
میدانوں کی تپش اعصابی کشمکش ہنگامہ پرور زندگی اور روزمرہ کے جھمیلوں سے دور مری کی حسین وادیوں میں آپ کا ذاتی پرسکون گوشہ عافیت مری کی قیمتوں پر صرف بیس دن کا کرایہ دیجئے اور 25 سال کے لیے ہر سال ایک ہفتے کی رہائشی ملکیت مفت حاصل کیجئے قدرت کے حسین نظاروں میں پہاڑ پر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے فیملی کے ساتھ چھٹیاں گزارنے کا ایک حسین منصوبہ تھوڑی سرمایہ کاری سے شاندار اور پرکشش منافع
قیمت آپ کے تصور سے بھی کم، سہولیات اور آسائش آپ کی خواہش سے بھی زیادہ
قیمت
10 ہزار سے 1 لاکھ تک
ادائیگی
10 فیصد ایڈوانس باقی 36 ماہ کی آسان اقساط نقد ادائیگی پر فوری رہائش
مزید تفصیلات کے لئے
ہیڈ آفس قاضی انٹرپرائزز
جنگ بلڈنگ مری روڈ راولپنڈی
فون 554464 فیکس 558633
E-mail: shaukat@isb.comsats.net.pk
web:www.qazi.com.pk

ماہنامہ

ترجمان القرآن

جلد ۱۲۶، عدد ۱۰، اکتوبر ۱۹۹۹، جمادی الثانی ۱۴۲۰

مدیر: پروفیسر خورشید احمد

نائب مدیر: مسلم سجاد

ترتیب

ادارتی امور

منصورہ، ملتان روڈ، لاہور

فون: ۵۴۲۵۳۵۲

فیکس: ۷۸۳۲۱۹۴

E-mail: tarjuman@pol.com.pk

مدیر انتظامی

عبدالکریم

۵-اے، ذیلدار پارک، اچھرہ، لاہور

فون: ۷۵۸۷۹۱۶-۷۵۸۵۵۹۰

☆

قیمت فی شمارہ: ۱۵ روپے

زرسالانہ: ۱۵۰ روپے

بھارت ۳۰۰ روپے

بنگلہ دیش، ایران ۳۵۰ روپے

مشرق وسطی، یورپ

مشرق بعید، افریقہ ۶۵۰ روپے

امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا ۹۰۰ روپے

مولانا محمد الیاسؒ کی خدمات

مولانائے محترم [مولانا محمد الیاس] نے خود اسی قوم [میواتی قوم] کے مبلغوں سے اس کی اصلاح کا کام لیا' اور ان کی پیہم کوششوں کا نتیجہ' جو میں اپنی آنکھوں سے دیکھ آیا ہوں' یہ ہے کہ بعض علاقوں میں گاؤں کے گاؤں ایسے ہیں جہاں ایک بچہ بھی آپ کو بے نمازی نہ ملے گا۔ دیہات کی وہ مسجدیں جہاں یہ لوگ کبھی اپنے مویشی باندھتے تھے' آج وہاں پانچوں وقت اذان اور جماعت ہوتی ہے۔ آپ کسی راہ چلتے دیہاتی کو روک کر اس کا امتحان لیں۔ وہ آپ کو صحیح تلفظ کے ساتھ کلمہ سنائے گا۔ اسلام کی تعلیم کا سیدھا سادا لب لباب' جو ایک بدوی کو معلوم ہونا چاہیے' آپ کے سامنے بیان کرے گا' اور آپ کو بتائے گا کہ اسلام کے ارکان کیا ہیں۔ اب آپ وہاں کسی مسلمان مرد' عورت یا بچے کو ہندوانہ لباس میں نہ پائیں گے۔ ان کی عادت و خصائل اور ان کے اخلاق میں بھی اس مذہبی تعلیم و تبلیغ کی وجہ سے نمایاں فرق ہو گیا ہے..... مولانا نے عام دیہاتیوں کے اندر تبلیغ و اصلاح اور امربالمعروف و نہی عن المنکر کی ایسی اسپرٹ پیدا کر دی ہے کہ جو لوگ کل تک خود گمراہ تھے' وہ اب دوسروں کو راہ راست بتاتے پھرتے ہیں۔ کھیتی باڑی کے کاموں سے فرصت پانے کے بعد مختلف قریوں سے ان دیہاتیوں کے چھوٹے چھوٹے گروہ تبلیغ کے لیے نکلتے ہیں۔ گاؤں گاؤں پہنچ کر لوگوں کو خیر و صلاح کی طرف دعوت دیتے ہیں۔ ان کا رخت سفر اور زاد راہ ان کے کندھے پر ہوتا ہے۔ کسی پر اپنا بار نہیں ڈالتے' نہ کسی سے اپنے لیے کچھ طلب کرتے ہیں۔ محض اللہ کی خوشنودی ان کے مدنظر ہوتی ہے اور بے غرضانہ کام کرتے ہیں' اس لیے جہاں جاتے ہیں' دیہات اور قصبات کی آبادیوں پر ان کا غیر معمولی اثر ہوتا ہے۔ مجھے معلوم ہوا کہ بسا اوقات یہ لوگ پیدل گشت کرتے ہوئے دو دو سو میل تک چلے جاتے ہیں' اور جن جن بستیوں پر سے گزر ہوتا ہے' وہ مذہبی بیداری اور کلمہ و نماز کے نور سے منور ہو جاتی ہیں..... دیہات سے جو تبلیغی جماعتیں نکلتی ہیں وہ نہ صرف دین کی تعلیمات پھیلاتی ہیں' بلکہ ساتھ ہی ساتھ خود بخود باہمی اخوت و محبت کے تعلقات بھی قائم کر لیتی ہیں۔ اس طرح قبائلی تفرقہ کی جگہ رفتہ رفتہ قومی وحدت پیدا ہو رہی ہے' اور ایک ایسی تنظیمی ہیئت وجود میں آتی جا رہی ہے جس سے آگے چل کر بہت سے کام لیے جا سکتے ہیں۔ تنظیم کا ماحصل اس کے سوا اور کیا ہے کہ کثیر التعداد افراد ایک آواز پر مجتمع ہوں اور ایک آواز پر حرکت کرنے لگیں۔ یہی چیز وہاں پیدا ہو رہی ہے اور بڑی حد تک پیدا ہو چکی ہے۔

یہ قابل قدر نتائج جو گنتی کے چند برسوں میں برآمد ہوئے ہیں' محض ایک مخلص آدمی کی محنت و کوشش کا ثمرہ ہیں۔ (سید ابوالاعلیٰ مودودی' "ایک اہم دینی تحریک" ترجمان القرآن جلد ۱۵' عدد ۲' شعبان ۱۳۵۸ھ' اکتوبر ۱۹۳۹ء' ص ۱۴۱۔۱۴۳)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

ترکی کا قیامت خیز زلزلہ

فاعتبروا یا اولی الابصار!

پروفیسر خورشید احمد

۱۷ اگست ۱۹۹۹ کو صبح تین بجے' جب ہمارے ترک بھائی اور بہنیں محو خواب تھے' صرف ۴ سیکنڈ میں زلزلے کے ایک قیامت خیز جھٹکے نے دولت عثمانیہ کے مرکز اور مرقد ترکی کے چھ کروڑ انسانوں ہی کو نہیں بلکہ پوری امت مسلمہ کو ہلا ڈالا۔ چشم زدن میں ہزاروں فلک بوس عمارتیں پیوند زمین ہو گئیں۔ ازمت کا صنعتی مرکز خاک کا ڈھیر بن گیا۔ تیل کی سب سے بڑی ریفائنری آتش کدہ بن گئی جس کی چنگاریاں آسمان سے باتیں کرنے لگیں۔ گل جوک (Golcuk) کا بحری اڈا اپنی ساری عسکری سطوت کے ساتھ ملبے کا ڈھیر بن گیا۔ ۲۰ ہزار مکان زمین بوس ہو گئے۔ مزید ۴۰ ہزار ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو گئے۔ ۴۵ ہزار انسان لقمہ اجل بن گئے۔ دس لاکھ افراد بے گھر ہو گئے۔ مالی نقصان کا ابتدائی اندازہ ۲۵ بلین ڈالر ہے جو پاکستان کی کل سالانہ آمدنی سے دوگنا ہے۔ بیسویں صدی کے سب سے تباہ کن زلزلے نے پوری قوم' پوری امت اسلامیہ' بلکہ پوری انسانیت کو ہلا ڈالا ہے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔

یورپ اور امریکہ کی ساری ٹیکنالوجی بھی میلوں پھیلے ہوئے ملبے کے اس ڈھیر سے چند سو انسانوں سے زیادہ کو نہیں نکال سکی اور جن کو اللہ نے بچانا تھا' وہ ۳ ماہ کے بچے' ۱۲ سال کے نوجوان اور ۸۰ سال کے بزرگ' ۶' ۷ اور ۱۰ دن ملبے تلے دبے رہنے کے بعد بھی زندہ برآمد ہو گئے:

كَلَّآ اِنَّهٗ تَذْكِرَةٌ ○ فَمَنْ شَآءَ ذَكَرَهٗ (المدثر ۷۴: ۵۴-۵۵) ہرگز نہیں' یہ تو ایک نصیحت ہے۔ اب جس کا جی چاہے اس سے سبق حاصل کر لے۔

قرآن اور تاریخ دونوں گواہ ہیں کہ انفرادی اور اجتماعی زندگی میں فساد اور بگاڑ صرف کفر' بغاوت اور نفاق ہی کے راستوں سے رونما نہیں ہوتا۔ ایک بہت بڑا دروازہ جس سے فتنہ و فساد' ظلم و جور' حق تلفی اور چیرہ دستی' خیانت اور قتل و غارت گری' فریب کاری اور بددیانتی' استحصال اور فحاشی کے عفریت دندناتے ہوئے داخل ہوتے ہیں اور خشکی اور تری کو بگاڑ اور فساد سے بھر دیتے ہیں' وہ غفلت ہے۔

غفلت وہ مرض ہے جو صرف کافر اور اللہ کے باغی ہی کو خدا فراموشی میں بدمست نہیں کرتا بلکہ بعض اوقات بہت سے اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا نام لینے والوں کے دیدہ و دل کو بھی ماؤف کر دیتا ہے اور ان کا حال یہ ہو جاتا ہے کہ آنکھیں ہیں مگر دیکھتے نہیں' کان ہیں مگر سنتے نہیں اور دل ہیں مگر تدبر اور تفہم سے محروم ہیں۔ وہ جانوروں کی طرح ہو جاتے ہیں بلکہ ان سے بھی گئے گزرے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو غفلت میں کھوئے گئے ہیں: لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا ز وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا ز وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا ط اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ط اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ ○ (الاعراف ۷:۱۷۹)

غفلت سے محفوظ رکھنے کے لیے جہاں خالق سماوات و ارض نے زمین کے گوشے گوشے اور خود انسان کی پور پور کے اندر اپنی بے شمار نشانیاں رکھ دی ہیں (وَفِي الْاَرْضِ اٰيٰتٌ لِّلْمُوْقِنِيْنَ ○ وَفِيْٓ اَنْفُسِكُمْ ط اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ۔ الذریٰت ۵۱: ۲۰-۲۱) اور اس سے نجات پانے کے لیے اہل ایمان کو مسلسل ذکر و فکر کی دعوت دی ہے (الَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۔ آل عمرٰن ۳: ۱۹۱) وہیں انسانوں کو غفلت سے بیدار کرنے کے لیے ایسے انفرادی اور اجتماعی حادثات رونما ہوتے ہیں جو ایک طرف انسان کو اپنی بے بسی اور کمزوری کا احساس دلاتے ہیں تو دوسری طرف اس بالاتر قوت کی طرف متوجہ کرتے ہیں جس کے قبضہ قدرت میں ہر شے ہے۔ اسی نے اس دنیا کو انسان کی آزمایش اور امتحان کے لیے پیدا کیا اور اسے وقتاً فوقتاً جھنجھوڑ کر غفلت سے بیدار کرنے اور راہ حق و صواب کی طرف پلٹنے اور اپنے رب کے دامن کو تھامنے کے مواقع فراہم کرتا رہتا ہے۔ قضا و قدر کا یہ نظام جہاں اپنے اندر تعلیم اور عبرت کا بے پناہ سامان رکھتا ہے' وہیں انسان کے لیے غفلت سے نکل کر خیر' حق اور معروف کی طرف پلٹنے کے امکانات اور محرکات بھی فراہم کرتا ہے۔ وہ جن کے دل و دماغ پر مہر لگ گئی ہے ان سب کے لیے مزید نشان عبرت بنا دیتا ہے کہ بار بار کی تنبیہوں کے باوجود گمراہی میں مگن اور تباہی کی طرف بگٹٹ رواں رہتے ہیں۔

اسلامی نظام فکر و عمل کا یہ ایک قاعدہ کلیہ ہے کہ انسان کی پوری زندگی ایک آزمایش اور امتحان ہے اور ہر شخص اپنے کیے کا ذمہ دار اور جواب دہ ہے۔ دنیوی زندگی میں جو بھی مصیبت یا تکلیف پیش آتی ہے وہ آنکھیں کھولنے کی ایک تدبیر ہے اور بیدار کرنے کے لیے ایک تازیانہ۔

وَمَآ اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ وَيَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ ○ وَمَآ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِيْنَ فِى الْاَرْضِ ج وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ○ (الشوریٰ ۴۲: ۳۰-۳۱) تم لوگوں پر جو مصیبت بھی آئی ہے' تمھارے اپنے ہاتھوں کی کمائی سے آئی ہے' اور بہت سے قصوروں سے وہ ویسے ہی درگزر کر جاتا ہے۔ تم زمین میں اپنے خدا کو عاجز کر دینے والے نہیں ہو' اور اللہ کے مقابلے میں تم کوئی حامی و ناصر نہیں رکھتے۔

آزمایش کا اصل مقصد اپنے آقا اور مالک اور راہ صواب کی طرف پلٹ آنے کی ترغیب اور تفہیم ہے:

كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ ط وَنَبْلُوْكُمْ بِالشَّرِّ وَالْخَيْرِ فِتْنَةً ط وَاِلَيْنَا تُرْجَعُوْنَ ○ (الانبیاء ۲۱: ۳۵) ہر جان دار کو موت کا مزہ چکھنا ہے اور ہم اچھے اور برے حالات میں ڈال کر تم سب کی آزمایش کر رہے ہیں آخر کار تمھیں ہماری ہی طرف پلٹنا ہے۔

اللہ نے اپنی پکڑ اور اس کے مقاصد سے انسان کو کھول کھول کر متنبہ کر دیا ہے:

اَفَاَمِنَ اَهْلُ الْقُرٰٓى اَنْ يَّاْتِيَهُمْ بَاْسُنَا بَيَاتًا وَّهُمْ نَآئِمُوْنَ ○ اَوَ اَمِنَ اَهْلُ الْقُرٰٓى اَنْ يَّاْتِيَهُمْ بَاْسُنَا ضُحًى وَّهُمْ يَلْعَبُوْنَ ○ اَفَاَمِنُوْا مَكْرَ اللّٰهِ ج فَلَا يَاْمَنُ مَكْرَ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْخٰسِرُوْنَ ○ (الاعراف ۷: ۹۷-۹۹) پھر کیا بستیوں کے لوگ اب اس سے بے خوف ہو گئے ہیں کہ ہماری گرفت کبھی اچانک ان پر رات کے وقت نہ آ جائے گی جب کہ وہ سوئے پڑے ہوں؟ یا انھیں اطمینان ہو گیا ہے کہ ہمارا مضبوط ہاتھ کبھی یکایک ان پر دن کے وقت نہ پڑے گا جب کہ وہ کھیل رہے ہوں؟ کیا یہ لوگ اللہ کی چال سے بے خوف ہیں۔ حالانکہ اللہ کی چال سے وہی قوم بے خوف ہوتی ہے جو تباہ ہونے والی ہو۔

اصل پکڑ تو آخرت میں ہو گی لیکن اس سے پہلے غفلت سے بیدار کرنے اور غلط کاریوں پر متنبہ کرنے کے لیے چھوٹے چھوٹے جھٹکے اس دنیا میں لگتے رہیں گے جو خدا سے ڈرنے والوں کو اپنے رب کی طرف پلٹنے کا موقع فراہم کریں گے۔

وَلَنُذِيْقَنَّهُمْ مِّنَ الْعَذَابِ الْاَدْنٰى دُوْنَ الْعَذَابِ الْاَكْبَرِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ○ (السجدہ ۳۲: ۲۱) اس بڑے عذاب سے پہلے ہم اسی دنیا میں (کسی نہ کسی چھوٹے) عذاب کا مزہ انھیں چکھاتے رہیں گے' شاید کہ یہ (اپنی باغیانہ روش سے) باز آ جائیں۔

بیدار کرنے والے یہ تازیانے جلدی جلدی بھی آ سکتے ہیں اور لمبی مدتوں اور لمبی ڈھیل دینے کے بعد بھی:

اَوَلَا يَرَوْنَ اَنَّهُمْ يُفْتَنُوْنَ فِىْ كُلِّ عَامٍ مَّرَّةً اَوْ مَرَّتَيْنِ ثُمَّ لَا يَتُوْبُوْنَ وَلَا هُمْ يَذَّكَّرُوْنَ ○ (التوبہ ۹: ۱۲۶) کیا یہ لوگ دیکھتے نہیں کہ ہر سال ایک دو مرتبہ یہ آزمایش میں ڈالے جاتے ہیں؟ مگر اس پر بھی نہ

توبہ کرتے ہیں نہ کوئی سبق لیتے ہیں۔

قرآن کے پورے نظام فکر و عمل پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کائنات کی یہ سلطنت اور اس کا پورا نظام کار صرف طبعی قوانین (physical laws) ہی سے عبارت نہیں بلکہ اس میں ایک عظیم اخلاقی قانون (moral law) بھی کار فرما ہے جس کے تحت خود اس دنیا میں مکافات عمل کا ایک سلسلہ جاری ہے۔ کچھ نتائج یہاں رونما ہوتے ہیں' لیکن مکمل نتائج یہاں رونما ہو ہی نہیں سکتے۔ یہ بالآخر آخرت میں سب کے سامنے ہوں گے۔

اس نظام کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اس زندگی میں بھی راحت و رنج' مفلسی اور امیری' غلبہ اور محکومی' قوت اور ضعف' صحت اور بیماری' ترقی اور تباہی' فراوانی اور قحط' غرض ہر طرح حالات انسان کی آزمایش کے لیے ہیں تاکہ خالق سماوات و ارض یہ دیکھے کہ انسان اچھے حالات میں شکر کی روش اختیار کرتا ہے یا غرور میں اندھا ہو کر' ظالم' خدا فراموش اور نفس کا بندہ بن جاتا ہے۔ اسی طرح اگر برے حالات سے سابقہ ہے تو اس میں صبر کا راستہ اختیار کرتا ہے یا کم ہمتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے' پست' ذلیل اور ناجائز راستے اختیار کر ڈالتا ہے جیسا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "مومن کا معاملہ عجیب و غریب ہے۔ اس کا تو ہر معاملہ اس کے حق میں سراپا خیر ہوتا ہے اور یہ بات مومن کے سوا کسی کو بھی حاصل نہیں ہے۔ اگر اسے خوشی اور راحت پہنچے تو شکر ادا کرتا ہے تو یہ اس کے لیے خیر ہوتا ہے۔ اور اگر اسے کوئی تکلیف و مصیبت پہنچے تو وہ صبر کرتا ہے تو یہ بھی اس کے لیے سرتاسر خیر ہوتا ہے"۔ ترمذی میں یہ اس طرح آیا ہے کہ مومن مردوں اور مومن عورتوں پر آزمایش آتی رہتی ہے کبھی خود اس پر کوئی آفت آتی ہے' کبھی اس کی اولاد پر' اور کبھی اس کے مال پر (اور وہ صبر اختیار کرتا ہے جس سے اس کا قلب صاف ہوتا ہے) یہاں تک کہ جب وہ اللہ تعالیٰ سے ملتا ہے تو اس کے ساتھ کوئی گناہ نہیں ہوتا۔

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ دنیاوی مصائب کے اخلاقی پہلو پر روشنی ڈالتے ہوئے سورۃ الشوریٰ کی آیت ۳۰ کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "واضح رہے کہ یہاں تمام انسانی مصائب کی وجہ بیان نہیں کی جا رہی ہے بلکہ روئے سخن ان لوگوں کی طرف ہے جو اس وقت مکہ معظمہ میں کفر اور نافرمانی کا ارتکاب کر رہے ہیں۔ ان سے فرمایا جا رہا ہے کہ اگر اللہ تمھارے سارے قصوروں پر گرفت کرتا تو تمھیں جیتا ہی نہ چھوڑتا لیکن یہ مصائبؔ جو تم پر نازل ہوئے ہیں (غالباً اشارہ ہے مکہ کے قحط کی طرف) یہ محض بطور تنبیہ ہیں تاکہ تم ہوش میں آؤ' اور اپنے اعمال کا جائزہ لے کر دیکھو کہ اپنے رب کے مقابلے میں تم نے کیا روش اختیار کر رکھی ہے اور یہ سمجھنے کی کوشش کرو کہ جس خدا سے تم بغاوت کر رہے ہو اس کے مقابلے

میں تم کتنے بے بس ہو' اور یہ جانو کہ جنھیں تم اپنا ولی و کارساز بنائے بیٹھے ہو' یا جن طاقتوں پر تم نے بھروسہ کر رکھا ہے' وہ اللہ کی پکڑ سے بچانے میں تمھارے کسی کام نہیں آسکتیں"۔

اسی طرح سورۃ السجدہ کی آیت ۲۱ کی تشریح میں مولانا مودودی لکھتے ہیں: "عذاب اکبر" سے مراد آخرت کا عذاب ہے جو کفر و فسق کی پاداش میں دیا جائے گا۔ اس کے مقابلے میں "عذاب ادنیٰ" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے جس سے مراد وہ تکلیفیں ہیں جو اسی دنیا میں انسان کو پہنچتی ہیں۔ مثلاً افراد کی زندگی میں سخت بیماریاں' اپنے عزیز ترین لوگوں کی موت' الم ناک حادثے' نقصانات' ناکامیاں وغیرہ اور اجتماعی زندگی میں طوفان' زلزلے' سیلاب' وبائیں' قحط' فسادات' لڑائیاں اور دوسری بہت سی بلائیں جو ہزاروں' لاکھوں' کروڑوں انسانوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہیں۔ ان آیات کے نازل کرنے کی مصلحت یہ بیان کی گئی ہے کہ عذاب اکبر میں مبتلا ہونے سے پہلے ہی لوگ ہوش میں آجائیں اور اس طرز فکر و عمل کو چھوڑ دیں جس کی پاداش میں آخر کار انھیں وہ بڑا عذاب بھگتنا پڑے گا۔ دوسرے الفاظ میں اس کا مطلب یہ ہے کہ دنیا میں اللہ تعالیٰ نے انسان کو بالکل بخیریت ہی نہیں رکھا ہے کہ پورے آرام و سکون سے زندگی کی گاڑی چلتی رہے اور آدمی اس غلط فہمی میں مبتلا ہو جائے کہ اس سے بالاتر کوئی طاقت نہیں ہے جو اس کا کچھ بگاڑ سکتی ہو' بلکہ اللہ تعالیٰ نے ایسا انتظام کر رکھا ہے کہ وقتاً فوقتاً افراد پر بھی اور قوموں اور ملکوں پر بھی ایسی آفات بھیجتا رہتا ہے جو اپنی بے بسی کا اور اپنے سے بالاتر ایک ہمہ گیر سلطنت کی فرمانروائی کا احساس دلاتی ہیں۔ یہ آفات ایک ایک شخص کو' ایک ایک گروہ کو اور ایک ایک قوم کو یہ یاد دلاتی ہیں کہ اوپر تمھاری قسمتوں کو کوئی اور کنٹرول کر رہا ہے۔ سب کچھ تمھارے ہاتھ میں نہیں دے دیا گیا۔ اصل طاقت اسی کارفرما اقتدار کے ہاتھ میں ہے۔ اس کی طرف سے جب کوئی آفت تمھارے اوپر آئے تو نہ تمھاری کوئی تدبیر اسے دفع کر سکتی ہے' اور نہ کسی جن' یا روح' یا دیوی اور دیوتا یا نبی اور ولی سے مدد مانگ کر تم اس کو روک سکتے ہو۔ اس لحاظ سے یہ آفات' محض آفات نہیں ہیں بلکہ خدا کی تنبیہات ہیں جو انسان کو حقیقت سے آگاہ کرنے اور اس کی غلط فہمیاں رفع کرنے کے لیے بھیجی جاتی ہیں۔ ان سے سبق لے کر دنیا ہی میں آدمی اپنا عقیدہ اور عمل ٹھیک کرے تو آخرت میں خدا کا بڑا عذاب دیکھنے کی نوبت ہی کیوں آئے" (تفہیم القرآن' جلد ۴' ص ۴۸)۔

بیسویں صدی کے اس سب سے تباہ کن زلزلے پر ایک مسلمان کے قلب و ذہن سے غور کیا جائے تو اس میں صرف ہمارے ترک بھائیوں اور بہنوں ہی کے لیے نہیں' پوری امت مسلمہ کے لیے عبرت اور موعظت کا بڑا سبق ہے۔ یہ ایک ایسا موقع ہے کہ جب ہم سب کو اپنی زندگی کے اخلاقی' سماجی' معاشی'

سیاسی پہلو اور تمام انفرادی اور اجتماعی معاملات کا جائزہ لینا چاہیے۔ کیا اب بھی وہ وقت نہیں آیا کہ ہم اپنے دل و دماغ اور فکر و نظر پر پڑے ہوئے غفلت، نفاق اور خدا فراموشی کے پردوں کو چاک کر دیں اور اپنے خالق کی طرف رجوع کریں، اپنی غلطیوں، کوتاہیوں اور بغاوتوں سے توبہ کریں اور اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے بتائے ہوئے راستے کی طرف خلوص دل سے پلٹ آئیں۔

ترکی کے غیور مسلمانوں کا ردعمل بالکل انھی فطری خطوط پر ہے۔ ان کا ایمان اپنے رب پر تازہ ہوگیا ہے۔ جغرافیائی حقائق، تحت زمین فاصلے اور زلزلوں کے متوقع مقامات (fault lines) اپنی جگہ --- اور مسلمان قدرتی اسباب کو نظرانداز نہیں کرتا--- لیکن یہ اسباب و عوامل تو ہمیشہ سے تھے اور ہمیشہ رہیں گے۔ قابل غور بات یہ ہے کہ ترکی کی تاریخ میں جب پہلا بڑا زلزلہ ۱۸۹۴ میں آیا، اس وقت دولت عثمانیہ اپنی آخری ہچکیاں لے رہی تھی، مغربی اقوام گدھوں کی طرح مسلم ترکی کی بوٹیاں نوچ رہے تھے، ترقی اور امن کے نام پر سیکولرزم اور قومیت کے عفریت ملت اسلامیہ پر مسلط ہو رہے تھے اور ترک قیادت غفلت اور عیش و عشرت میں مگن تھی۔ ایک طرف یورپین اقوام سے قرض لے رہی تھی اور دوسری طرف انھی سے امن کی بھیک مانگ رہی تھی۔ وہ قوم جس نے چار سو سال تک ایک چوتھائی دنیا پر اسلام کے پرچم کو لہرایا تھا، وہ ہر قدم پر پسپائی اختیار کر رہی تھی۔ انیسویں صدی کے اختتام پر پڑنے والا تازیانہ عبرت قوم کو بیدار کرنے میں ناکام رہا اور بالآخر دولت عثمانیہ صرف اناطولیہ تک محدود ہو گئی اور اس سے بڑھ کر یہ کہ ترک قوم جو اسلام کے پیغام کی علم بردار اور امت مسلمہ کی آبرو کی محافظ تھی سیکولرزم اور مغربی اباحت پرستی کی آماجگاہ بن گئی۔ اس پورے عرصے میں اسلامی قوتیں برسر پیکار رہیں۔ اس کے نتیجے میں گذشتہ پچاس سال میں اسلامی احیا کی لہریں زندگی کے ہر شعبہ میں رونما ہوئی ہیں اور عوامی تائید سے غلبہ کے قریب پہنچ گئی ہیں لیکن فرنگی نظام کے پاسبان اسلامی احیا کی ہر رو کو جبر و تشدد سے دبانے پر تلے ہوئے ہیں اور مسلمان عورت کو یہ حق بھی حاصل نہیں کہ وہ اپنی مرضی کا لباس پہن سکے اور اپنے آپ کو حجاب کا پابند بنا سکے۔

بیسویں صدی کے ان آخری مہینوں میں آنے والے اس زلزلے نے در و دیوار ہی کو نہیں ہلا ڈالا، اس نے دل و دماغ میں بھی ایک ہلچل پیدا کر دی ہے اور فوج اور سیکولر حکمران طبقے (establishment) کے ایک محدود طبقے کو چھوڑ کر زندگی کے ہر شعبے سے متعلق باشعور مسلمان اس آفت کو عذاب الٰہی کی ایک شکل اور غالب نظام زندگی کے لیے ایک تازیانہ تصور کر رہے ہیں اور اس کا برملا اظہار کر رہے ہیں۔ صدر اور وزیراعظم تو بس حکم ربی (Act of God) کہہ کر چپ ہوگئے لیکن نوجوان اپنے اضطراب اور ظالمانہ سیکولر نظام سے برأت کا برملا اظہار کر رہے ہیں۔ لندن کا اخبار فائنی نانشل ٹائمز ان جذبات کی اس طرح عکاسی کرتا ہے:

گذشتہ ہفتے کے زلزلے نے ترکی میں آزاد سول انتظامیہ کی کمی کو واشگاف کر دیا ہے اور اب بہت

سے لوگ یہ سوال کر رہے ہیں کہ اسلامی اور دوسرے گروہوں پر پابندی کی ریاست نے کیا قیمت ادا کی ہے؟ بہت سی جگہوں پر محرومی اور مایوسی کا احساس نئے آغاز کی انقلابی خواہش میں تبدیل ہو گیا ہے۔ انگریزی اخبار ڈیلی نیوز کے کالم نگاروں نے سول انتظامیہ اور اسلامی عناصر کے تحت کام کرنے والی کمپنیوں کے درمیان امتیاز کے خاتمے کا مطالبہ کیا ہے۔ ان جذبات کا اظہار آدابازاری کیفے میں ہوا جہاں ایک آدمی نے کہا: ہم اتحاد اور بھائی چارے کی طرف لوٹ رہے ہیں۔ کیفے کے مسلمان مالک نے کہا: "میں اپنے مذہبی عقائد پر اپنی خواہش کے مطابق عمل نہیں کر سکتا۔ میرے اوپر پابندیاں ہیں"۔ سڑک کے دوسری طرف ایک اسلامی بنک کاری تنظیم اخلاص فنانس کے ایک نوجوان نے زیادہ آگے بڑھ کر یہ کہا: حکومت ہمارے ساتھ اپنے رویے کو کبھی تبدیل نہیں کرے گی۔ میرا یہ یقین ہے کہ یہ زلزلہ اسلامی عناصر کے ساتھ حکومت کی بدسلوکی کا نتیجہ ہے۔ (۲۳ اگست ۱۹۹۹)

اسی اخبار کے نمایندے نے اسلامی تنظیموں اور مسلمان رضاکاروں کی خدمتی سرگرمیوں کا ذکر کیا ہے کہ کس طرح ہر طرف سے یہ نوجوان تباہ حال خاندانوں کی مدد اور خدمت کے لیے امڈ پڑے ہیں۔

لندن کے ایک دوسرے روزنامے دی گارجین کا نمایندہ Chris Morris استنبول سے لکھتا ہے:

شمال مغربی ترکی کے مسلمان جب کل جمعہ کی نماز پڑھنے جا رہے تھے تو ان میں سے کچھ نے یہ خیال ظاہر کیا کہ گذشتہ ہفتے کا تباہ کن زلزلہ جس نے ہزاروں جانیں لے لیں' کہیں خدا کی طرف سے کوئی تنبیہ تو نہیں؟ استنبول کے مضافات میں غذا کے لیے لائن میں کھڑے ہوئے ایک آدمی نے کہا: یہاں قحبہ گری ہے' یہاں رشوت ہے۔ ہمیں اس کی سزا دی جا رہی ہے۔ ہمیں فکر کرنا چاہیے۔ (۲۸ اگست ۱۹۹۹)

اس نامہ نگار کے بہ قول استنبول کے بہت سے علاقوں میں لوگوں نے شراب کی دکانوں کے شیشے توڑ دیے۔ پورے ملک میں فضیلت پارٹی کے نوجوان کارکن گھر گھر اور خیمہ خیمہ جاکر تباہ حال خاندانوں کی مدد کر رہے ہیں اور ان کے لیے سر چھپانے کا انتظام کر رہے ہیں۔

گارجین کا نمایندہ' ایوی جلر (Avicilar) کے علاقے کا دورہ کر کے لکھتا ہے:

ایوی جلر شاید اسلام پسندوں کا کوئی مضبوط گڑھ نہیں ہے لیکن یہاں بھی ایسے لوگ مل جائیں گے جو مذہبی سرگرمیوں پر سرکاری پابندیوں کو ناپسند کرتے ہیں۔ لوگ دینی مدرسوں کی بندش' سرکاری عمارتوں میں اسلامی طریقے سے سر ڈھانپنے پر پابندی سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ خدا ناراض ہے۔

لیکن اس سب کے باوجود یہی نمایندہ لکھتا ہے کہ حکومت کا رویہ جارحانہ ہے اور اسلامی تنظیموں اور کارکنوں کو خدمت کرنے سے روکا جا رہا ہے' بنکوں میں ان کی رقوم پر قبضہ کیا جا رہا ہے اور ان کے سامان

سے بھرے ہوئے ٹرک لوٹائے جا رہے ہیں۔

ڈاکٹر نجم الدین اربکان نے' جن پر سیاسی بات کرنے پر پابندی ہے' دعائیہ انداز میں اپنی بات کہی ہے:

اللہ تعالیٰ ہماری غلطیوں کو معاف کرے' ہمیں سیدھے راستے پر چلائے اور ہمیں رہنمائی فراہم کرے۔ (دی گارجین '۲۸ اگست ۱۹۹۹)

ایک سینیر جج نے ہمت کر کے پورے نظام پر سخت تنقید کی ہے۔ دی انڈی پنڈنٹ 'لندن کا مقالہ نگار Justin Hugler اپنے ایک مضمون Hands Accross the Rubble of Earth quakes میں فوج اور سیاسی قیادت پر لوگوں کے عدم اعتماد کا اظہار کرتے ہوئے لکھتا ہے:

پاپانید رو کے یورپی یونین کے بم کے چند روز بعد ہی ترکی کے ایک سینیر جج نے بھی ایک اپنا بم پھینکا۔ اس نے مطالبہ کیا کہ ترکی کے پورے دستور کو دوبارہ مرتب کیا جائے۔ اس کا کہنا تھا کہ یہ ایک مریض اور بھونڈی ریاست ہے جو اپنے عوام پر اعتماد نہیں کرتی اور عدالتوں میں ان سے ان قوانین کی بنیاد پر مقابلہ کرتی ہے جن کو سیاسی پالیسی کے طور پر اختیار کیا گیا ہے۔ یہ بات سمیع سیلوق نے آزادی اظہار پر پابندیوں کی مذمت کرتے ہوئے کہی۔ مسٹر سیلوق کے خیالات کی وسیع پیمانے پر تحسین کی گئی۔

بطور مشتے نمونہ از خروارے' یہ ہے ان جذبات و احساسات کی ایک جھلک جن کا اظہار ساری پابندیوں کے باوجود زندگی کے مختلف شعبوں سے متعلق افراد برملا کر رہے ہیں۔ سیکولر قیادت اپنے غرور اور زعم میں مبتلا ہے لیکن عام مسلمانوں کا رجوع الی اللہ اور اس کے دین کے ساتھ لگاؤ تیزی سے بڑھ رہا ہے۔ وہ اس ظالمانہ نظام سے نجات کے خواہاں ہیں جس نے ان کے' ان کے دین' ان کی تاریخی روایات اور ان کے دل کے سکون کو چھین لیا ہے۔ مغرب اس نئی رو سے اتنا خوف زدہ ہے کہ فائنی نانشل ٹائمز کی مقالہ نگار Lezleh Boulton اا' ۱۲ ستمبر کے شمارے میں اس خدشے کا اظہار کر رہی ہے کہ "ترک سلطنت کا احیا دوبارہ کیوں؟" ("Why the Turkish Empire may strike back"?) اس کا خیال ہے کہ ملک میں دولت عثمانیہ کی عظمت رفتہ کے احیا کے جذبات پھر سے جنم لے رہے ہیں اور ترک عوام محسوس کر رہے ہیں کہ وہ خود اپنے معاملات پر قادر نہیں بلکہ دوسروں کے زیر اثر ہیں۔ ایک عام مغرب زدہ خاتون تک کا یہ احساس ہے کہ

بیشتر ترک اپنے شہنشاہانہ ماضی کے اس شان دار دور پر بات کرنے کو ترجیح دیتے ہیں جس کے عروج کے وقت عثمانیوں کی افواج ویئنس کے دروازوں پر پہنچ گئی تھیں۔ مسلمان سلاطین ایسی سلطنت پر حکومت کر رہے تھے جو دوسری قومیتوں اور مذاہب کے لیے غیر معمولی طور پر روادار تھی۔ عثمانیہ سلطنت اس وقت اسی طرح دنیا پر حکمران تھی جس طرح آج امریکہ ہے۔ یہ بات ایک ٹرک ڈرائیور

تو را گیسی نے کہی۔ (دی فائنی نانشل ٹائمز، ۱۱، ۱۲ ستمبر ۱۹۹۹)

اخلاقی، دینی اور نظریاتی پہلو کے ساتھ ساتھ مادی اور تدبیر منزل کے نقطۂ نظر سے بھی جائزے اور احتساب کی ضرورت ہے۔ ترک قوم اس پہلو سے بھی بے حد مضطرب اور حالات کے تجزیے میں مصروف ہے۔

اسلام میں قضا و قدر کا تصور اسلام کے باقی تمام تصورات کی طرح انقلابی ہے۔ بلاشبہ ایک پتا بھی اللہ کی مرضی کے بغیر نہیں ہلتا اور ہر چیز پر خدا کی مشیت غالب اور بالادست ہے، لیکن جہاں طبیعی معاملات کے اخلاقی اور نظریاتی پہلو ہیں، وہیں طبیعی پہلوؤں کا مطالعہ اور ان کو متاثر کرنے کی کوشش اسلامی تصور کا ایک جزولاینفک ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ پر توکل کرو لیکن اپنا اونٹ باندھ کر رکھو۔ نہ اونٹ باندھنا توکل کے خلاف ہے اور نہ توکل کے یہ معنی ہیں کہ اب اونٹ باندھنے کی ضرورت نہیں رہی۔ فتح و شکست اللہ کے ہاتھ میں ہے لیکن جنگ کی تیاری اور زیادہ سے زیادہ طاقت کا حصول اور مقابلے کے لیے تیار بندھے رہنے والے گھوڑے مہیا کرنا بھی اسی حکمت عملی کا حصہ ہے۔ بیماری اور موت اللہ کی طرف سے ہے لیکن اسی اللہ نے ہر مرض کے لیے علاج کا بھی سامان فرمایا ہے اور ہر مرض کے لیے علاج کی تلاش اور اس سے استفادہ بھی قضا و قدر ہی کا حصہ ہے۔ جب عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے عہد خلافت میں ایک مسلمان علاقے میں طاعون کی وبا پھوٹی تو خلیفۃ المسلمین نے وہاں کے باشندوں کو ہدایت کی جو اس علاقے میں ہیں ڈر کر نہ بھاگیں اور جو باہر ہیں وہ وبا کے علاقے میں نہ جائیں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ابوخزامہ نے اپنے والد سے روایت کیا ہے کہ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے قضا و قدر کے سلسلے میں سوال کیا کہ "جھاڑ پھونک کا ہمارے ہاں رواج ہے، دوا دارو اور علاج معالجہ بھی ہوتا ہے اور دشمن کا حملہ ہو تو ڈھال سے بچاؤ بھی کیا جاتا ہے۔ کیا یہ سب چیزیں خدا کی مقرر کی ہوئی تقدیر کو پھیر سکتی ہیں؟ تو آپؐ نے فرمایا: "یہ بھی تقدیر کا ایک سلسلہ ہے"۔

ترکی میں زلزلے سے ہونے والی تباہی کی جو تفصیلات سامنے آئی ہیں، انھیں پڑھ کر یہ سوال بھی ابھرتا ہے کہ کیا وجہ ہے کہ ترکی کے زلزلے میں جدید دور کی نئی عمارتیں کاغذ کے گھروندوں کی طرح بیٹھ گئیں جب کہ پرانی عمارتیں جھٹکوں کو سہہ گئیں یا معمولی ٹوٹ پھوٹ کا نشانہ بنیں۔ اس ذیل میں کئی بڑے اہم سوال اٹھائے جا رہے ہیں یعنی:

الف: زلزلے کی زد میں آنے والے علاقے دنیا کے کچھ حصوں میں معلوم و معروف ہیں۔ خصوصیت سے ترکی، یونان، وسط ایشیا، ایران کی فالٹ لائنز (fault lines) جانی پہچانی ہیں۔ پھر ان علاقوں میں ایسی تعمیرات کی اجازت کیوں دی گئی جو زلزلے کے متوقع جھٹکوں کو برداشت کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتیں۔ نیز فن تعمیر میں ان احتیاطوں کو کیوں نہ ملحوظ رکھا گیا جو نقصان کو کم سے کم کرنے کا ذریعہ بن سکتیں؟ انھی علاقوں میں چار سو اور تین سو سال پہلے کی بنی ہوئی عمارتیں زلزلے کے جھٹکوں کو برداشت کر گئیں لیکن دوسری جنگ کے بعد اور گذشتہ

بیس سال میں بننے والی اونچی اونچی عمارتیں زمین بوس ہو گئیں۔ نئی بستیاں آباد کرنے میں خصوصیت سے اہم صنعتوں اور ریفائنریوں کے قیام کے لیے مخدوش علاقوں سے احتراز کیوں نہیں کیا گیا؟ یہ کیسی ٹاؤن پلاننگ ہے جو زمینی حقائق کو مدنظر رکھے بغیر کی گئی ہے۔

ب: اس پورے علاقے میں ریکٹر اسکیل میں ۱۰ درجے تک کے زلزلوں کا امکان تاریخی معلومات کی روشنی میں موجود تھا۔ نیز ۱۰ درجے تک کے زلزلوں کو برداشت کرنے والی ٹکنالوجی بھی معروف اور موجود ہے۔ امریکہ میں کیلی فورنیا اور جاپان کے بیشتر علاقے کی بھی یہی کیفیت ہے اور یہاں ایسی تعمیراتی ٹکنالوجی کم از کم پچاس ساٹھ سال سے استعمال ہو رہی ہے۔ تعمیرات کے لیے ایسے قواعد و ضوابط بنائے جا چکے ہیں جو عام حالات میں اس درجے کے زلزلوں کو برداشت کر سکتے ہیں یا کم از کم نقصان کو کم از کم حد تک رکھ سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ سان فرانسسکو میں ۱۹۸۹ کے زلزلے میں جو ۱ء۷ درجہ ریکٹر اسکیل کا تھا' گو مالی نقصان وسیع پیمانے پر ہوا مگر مرنے والوں کی تعداد ۶۲۹ تھی۔ جب کہ ترکی میں ۴ء۷ درجہ ریکٹر اسکیل کے حالیہ زلزلے میں جاں بحق ہونے والوں کی تعداد ۴۰ سے ۴۵ ہزار ہے۔ جس انداز میں عمارتیں گری ہیں' خصوصیت سے نئی عمارتیں' ان سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ تعمیراتی قواعد و ضوابط کی پابندی نہیں کی گئی اور کرپشن کی وجہ سے صحیح مقدار میں تعمیراتی لوازمہ بھی استعمال نہیں کیا گیا۔

ج: زلزلے کی بروقت اطلاع کے بارے میں حکومت اور اس کے اداروں نے مجرمانہ غفلت برتی ہے۔ صدر مملکت تک کو زلزلے کی اطلاع اصل واقعے کے چار گھنٹے بعد ہوئی۔ محکمہ موسمیات کو زلزلے کا اندازہ زلزلے کے بعد ہوا۔ وارننگ کا کوئی نظام موجود نہیں تھا۔ پھر ایسی ایمرجنسی کا مقابلہ کرنے کے لیے کوئی تیاری اور ٹریننگ نہیں تھی۔ آج حادثوں سے نبٹنے (disaster management) کا ایک معروف نظام موجود ہے۔ یونان اور اسرائیل اس لحاظ سے تیار تھے اور زلزلے کے چند ہی گھنٹے کے بعد ان کی امدادی ٹیمیں پہنچ گئیں' لیکن ترکی کے پاس اپنا کوئی نظام نہ تھا بلکہ بیرونی مددگاروں سے کام لینے کا بھی کوئی نظام نہ تھا۔ نظام مواصلات کا یہ حال تھا کہ زلزلے کے ۲۴ گھنٹے بعد بھی وزیراعظم صاحب تک کو ہدایات دینے کے لیے ریڈیو اور ٹی وی کو استعمال کرنا پڑا۔ فوج بھی زلزلے کے پانچویں دن میدان میں آئی جس پر سارا ملک چیخ اٹھا ہے۔ جس درجے پر تباہی واقع ہوئی' اس میں شہری پلاننگ کی بے قاعدگیاں' ٹھیکے داروں کی بدعنوانیاں' سرکاری عملہ کی کوتاہیاں اور کرپشن اور تعمیراتی لوازمہ کے غیر معیاری ہونے کا بھی اہم دخل ہے۔ ان سب کا احتساب ہونا چاہیے۔ نیوزویک نے اپنی ۳۰ اگست کی اشاعت میں درست ہی کہا ہے:

بہت سے ترک حکام یہ سمجھتے ہیں کہ کیلی فورنیا سے اصل فرق یہ ہے کہ بیشتر ترک ٹھیکیدار غیر معیاری تعمیر کرتے رہے ہیں اور معائنے کا کوئی ایسا انتظام نہیں ہے جو ان کو روک سکے۔ یہ بہت سادہ سی بات ہے کہ ایک کنکریٹ بنانے کے لیے زیادہ ریت اور کم سیمنٹ استعمال کی جائے یا مطلوبہ

ضرورت سے بہت کم لوہے کا استعمال کیا جائے، بغیر اس کے کہ کوئی اس فرق کو نوٹ کرے۔

لندن اکانومسٹ نے پوری صورت حال کو اپنے ایک تازہ اداریے میں یوں سمیٹ لیا ہے:

> جوں جوں ترکی کے زلزلے کے نتیجے میں ہلاک ہونے والوں کی تعداد سامنے آتی گئی، اس کے ساتھ ہی امداد اور جانیں بچانے کے سرکاری انتظامات کی سست روی بھی واضح ہوتی گئی۔ گذشتہ ہفتے کے صدمے اور افسوس کے بعد اب ترکی میں سب سے بڑا احساس غصے کا ہے۔ غصہ حکومت پر، کہ وہ مدد پہنچانے اور بچنے والوں کو مدد دینے کے لیے بہت دیر سے حرکت میں آئی۔ غصہ ملکی نوکر شاہی پر، جنھوں نے غیر معیاری عمارات کی اجازت دی جو ریت کے گھروندوں کی طرح بیٹھ گئیں۔ غصہ اپنے ملک کی فوج پر، جو جلدی مدد کے لیے نہ آئے۔ یہ غصہ بیشتر صورتوں میں درست اور جائز ہے۔
>
> یہ بات ناقابل یقین محسوس ہوتی ہے کہ ترکی کے پاس، جو ایک ارضیاتی فالٹ لائن پر واقع ہے۔ جانیں بچانے کا کوئی تربیت یافتہ عملہ نہ تھا۔ حکومت نہ صرف اس طرح کی کسی ٹیم کو تربیت دینے اور سامان فراہم کرنے میں ناکام رہی بلکہ یہ اس واحد ادارے کو بھی متحرک کرنے میں ناکام رہی جس کی طاقت اور ڈسپلن روایتی ہے یعنی فوج۔ جب غیر ملکی ماہرین ملبے کے اندر سوراخ کر کے اور کاٹ کر اپنا راستہ بنا رہے تھے، اور جب ترک رضاکار اپنے مشینری اوزار اور ہاتھوں سے خوراک اور ادویات فراہم کر رہے تھے، ان کی حکومت بالکل جامد کھڑی تھی۔ فوج، جو خود حادثات کا شکار تھی، زلزلے کے مکمل ۴ دن بعد ہفتے کے روز سرگرم ہوئی۔ ان دونوں ناکامیوں کی مکمل ذمہ داری حکومت پر عائد ہوتی ہے۔

اکانومسٹ قوم کی کیفیت کا صفائی سے یوں اظہار کرتا ہے:

> اس ہفتے اپنی ریاست پر ترک عوام کے غم و غصے کا اظہار حیران کن تھا۔ کیا یہ تبدیلی کے لیے قوت میں تبدیل ہو جائے گا۔ شاید ایسا ممکن ہو اگر اس کی وجہ سے حکومت کے ایک فرد نے جس انکسار کا اظہار کیا، اس میں اضافہ ہو، اور اگر یہ ترکی میں زیادہ کھلی فضا اور آزادی کی اجازت دینے کی شکل اختیار کرے، خواہ اس سے ۱۹۲۳ کے اتاترک کے ورثے میں چھوڑے ہوئے سیکولر عقیدے کو چیلنج کیا جائے۔

اگر اگست کا زلزلہ قوم کی آنکھیں کھول دیتا ہے، سیکولر نظام کے پائے چوبین کو پوری طرح نمایاں کر دیتا ہے، قوم کی اسلامی امنگوں کے اظہار کا راستہ کھل جاتا ہے اور عدل، دیانت اور خدا ترسی پر مبنی نظام کے بروئے کار آنے کی راہیں ہموار ہو جاتی ہیں تو جو دکھ ترک قوم نے اس زلزلے کی تباہ کاری کی شکل میں اٹھائے ہیں ان کا کچھ مداوا ہو سکے گا اور ترکی ایک بار پھر ان عظمتوں اور بلندیوں کی طرف اٹھنے کی راہ پر گامزن ہو گا جن کی جھلک دولت عثمانیہ کی تاریخ میں دیکھی جا سکتی ہے اور جس کی تابندہ نشانیاں جامع

سلیمانیہ' جامع سلطان احمد اور قصر توپ کاپی کی صورت میں آج بھی دیکھی جا سکتی ہیں۔

ترکی کے زلزلے نے جن مزید سوالات کو جنم دیا ہے ان کا تعلق صرف ترکی سے نہیں پوری ملت اسلامیہ سے ہے۔ کراچی' قاہرہ' کانو اور مراکش کی عمارتیں اور ان کو بسانے والے بھی انھی خطرات کی زد میں ہیں جنھوں نے حال ہی میں ازمت' انقرہ اور استنبول کو اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔ مسلم دنیا کے باقی علاقوں کی اخلاقی اور دینی حالت بھی ترکی سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہے اور نظام حکمرانی' تعمیراتی دیانت' نگرانی اور احتساب کا نظام نیز سیاسی اور شخصی آزاد پرستی کی کیفیت بھی ترکی سے بہت مختلف نہیں۔ بیرونی قوتوں کی گرفت اور دراندازیوں میں بھی زیادہ فرق نہیں۔ سبھی کا حال یہ ہے کہ تن ہمہ داغ داغ شد' پنبہ کجا کجا نہم!

ترکی کا زلزلہ صرف اہل ترکی کے لیے عبرت کا تازیانہ نہیں' پوری ملت اسلامیہ کو خواب خرگوش سے بیدار کرنے والی پکار ہے۔ سیاسی آزادی کے باوجود فکری' تہذیبی' معاشی' اخلاقی اور غلامی کا وہی حال ہے۔ مسلمان آج خود اپنی سرزمین پر اپنی قسمت کو اپنی اقدار اور ایمان کے مطابق تعمیر کرنے کے حق سے محروم ہیں۔ بددیانتی اور کرپشن زندگی کے شعار بن گئے ہیں۔ امت کے وسائل امت کی بہتری پر خرچ کیے جانے کے بجائے چند خاندانوں کے عیش و عشرت کا ذریعہ بنے ہوئے ہیں۔ ترکی ہی نہیں کسی بھی مسلمان ملک کے پاس حوادث سے نبٹنے کا نظام (disaster management) موجود نہیں ہے۔ اگر صرف تیل کی دولت پر خمس عائد کر دیا جائے تو وہ پوری مسلم دنیا سے غربت' افلاس' ناخواندگی اور بیماری کا خاتمہ کرنے اور معاشی اور سماجی ترقی کے اعلیٰ مراتب حاصل کرنے کے لیے کافی ہے۔ آج مسلمان ملک دفاعی اخراجات کے نام پر جو رقم مغربی ممالک کو تحفہ میں دے رہے ہیں اس کی ایک چوتھائی بھی مسلم دنیا کو دور جدید کی ایک قابل ذکر قوت بنانے کے لیے کافی ہے۔ مسلمان ممالک کے حکمرانوں' بادشاہوں اور سرمایہ داروں کی جو رقوم صرف مغربی ممالک کے بنکوں میں رکھی ہوئی ہیں' ان کا ایک معمولی حصہ ساری مسلم دنیا کے مضطر اور مفلوک الحال لوگوں کو اس عذاب سے نکالنے کے لیے کافی ہے۔ لیکن قوم اور خصوصیت سے اس کی قیادت غفلت کا شکار ہے۔

آج ضرورت اس بات کی ہے کہ امت مسلمہ اپنے گھر کو درست کرے۔ دوسروں پر انحصار ختم کرے اور اپنے وسائل سے' اپنے نظریات اور اقدار کے مطابق اپنی دنیا تعمیر کرے۔ ترکی کے زلزلے کے بعد اسرائیل سے جو ٹیم مدد کے لیے آئی تھی' اس کے ایک ڈاکٹر نے ایک ۱۱ سالہ لڑکی کی جان بچائی اور ۷ گھنٹے اس مہم میں صرف کیے لیکن نیوز ویک کے مطابق:

> ان طویل گھنٹوں میں جب ہم نے اس کی جان بچائی' ہم نے اسے عبرانی زبان کے کچھ الفاظ بھی سکھائے اور اعتماد کا رشتہ قائم کیا۔

مقام عبرت ہے کہ ہمارے دشمن کس طرح سرگرم عمل ہیں اور مسلمان سو رہے ہیں۔ ترکی کے

زلزلے اور اس کے نتیجے میں رونما ہونے والے واقعات اور حالات سے پوری امت کی آنکھیں کھل جانی چاہییں۔ ہمارے پاس وہ تمام وسائل ہیں جن سے ہم اپنے حالات کو سنوار سکتے ہیں لیکن ہم میں وہ جذبہ' وہ تحریک اور وہ قیادت نہیں جو وقت کے تقاضوں کو اسلام کے مطابق اور امت کے مفاد میں پورا کر سکے۔ اسلامی ترقیاتی بنک اور او آئی سی (Organisation of Islamic Conference) تو موجود ہیں' مگر وہ امت کو صحیح قیادت فراہم کرنے اور اس کی ضرورتوں کے مطابق نظام عمل بنانے میں ناکام ہیں۔ کیا اب بھی وقت نہیں آیا کہ مسلمان اپنے وسائل کو اپنے ہاتھوں میں لیں اور ان کا صحیح استعمال سیکھیں اور سب مل کر ملت کو غیروں کے تسلط سے نجات دلائیں۔ صرف اس صورت میں وہ اپنے لیے ایک نئی دنیا تعمیر کر کے حقیقی آزادی اور سربلندی کی منزل تک پہنچ سکتے ہیں۔

اشاعت میں اضافے کی مہم

علمی' دعوتی' مسلکی اور تبلیغی پرچے تو بے شمار ہیں اور ان میں سے ہر ایک نے' اپنے اپنے انداز اور اپنے اپنے میدان میں کم یا بیش خدمات بھی انجام دی ہیں لیکن بیسویں صدی کی امت اسلامیہ پاک و ہند کی تاریخ میں اسلام کے احیا اور ملت کو اس کے اصلی مشن کے لیے ایک بار پھر کمربستہ کرنے میں جو کردار ترجمان القرآن نے ادا کیا ہے وہ منفرد اور تابناک ہے۔ ایک غیر مسلم اہل قلم (ولفریڈ اسمتھ) نے صحیح ہی لکھا تھا کہ مستقبل کا مورخ اس مجلے کے تاریخی کردار کو نظرانداز نہیں کر سکتا۔ میری نسل کے لوگوں کے لیے تو مسئلہ تاریخ کا نہیں بلکہ خود ان کی زندگیوں کے رخ کو بدلنے اور انھیں "آشفتہ مغز' آشفتہ ہو" کے زمرے سے نکال کر حق و باطل کی کشمکش میں اعلائے کلمتہ الحق کے لیے سرگرم عمل کر دینے میں اس مجلے کا کردار فیصلہ کن رہا ہے۔ بلاشبہ یہ مجلہ تحریک گر بھی ہے اور دور حاضر میں تحریک اسلامی کی آواز اور اسلام کے دور جدید کا نقیب بھی۔

جنوری ۱۹۹۷ میں جب مجھ پر اچانک ترجمان القرآن کی ادارت کی ذمہ داری پڑی تو یہ میرے لیے سعادت سے کہیں زیادہ ایک آزمایش تھی۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی رحمتہ اللہ علیہ نے ۴۶ سال اس پرچہ کی آبیاری اپنے خون اور پسینہ سے کی اور اسے امت مسلمہ کے لیے روشنی کا مینار بنا دیا۔ محترم عبدالحمید صدیقی اور محترم نعیم صدیقی نے اپنے خون جگر سے اس کی لو کو روشن رکھا۔ پھر خرم بھائی نے ۶ سال اسے اپنے شب و روز کا محور و مرکز بنا لیا اور آخری سانس تک اس کی خدمت انجام دیتے اور اس کے پیغام کو وسیع تر حلقوں تک پہنچاتے رہے۔ میں اپنے ان تمام محسنوں اور پیش رووں کے مقابلے میں علم و عمل' ہر میدان میں سب سے فرومایہ تھا لیکن صرف ادائے فرض اور حرص حسنات کے جذبے سے' اپنی صحت کی

خرابی کے باوجود' اس ذمہ داری کو خوف بھرے دل اور کانپتے ہاتھ قبول کیا۔ اللہ اپنی رحمتیں نازل کرے ان مخلص ساتھیوں پر جن کے تعاون اور رفاقت کے سہارے یہ کام ہو رہا ہے۔ مسلم سجاد اور عبدالکریم صاحبان اپنے دوسرے ساتھیوں کے تعاون سے اس ذمہ داری کو ادا کر رہے ہیں اور اس عظیم مشن کی خدمت میں مصروف ہیں۔

آج ہم ترجمان کے قارئین کو ان کی ایک اہم ذمہ داری کی طرف متوجہ کرنا چاہتے ہیں۔

ترجمان القرآن کو محض خود حاصل کر لینا اور پڑھ لینا کافی نہیں۔ یہ بھی ہماری ذمہ داری ہے کہ اسے ہر طالب حق تک پہنچائیں بلکہ جہاں طلب موجود نہیں ہے' وہاں بھی طلب پیدا کرنے کی کوشش کریں۔ ہر انسان تک پہنچنا اور ہر دروازے پر دستک دینا ہماری ذمہ داری ہے۔ یہ بھی یاد رکھیے کہ ہم سے اس معاملے میں باز پرس ہو گی۔ محض اپنے حلقے میں بیٹھ کر خوش ہو لینا اور ایک دوسرے کو داد دینا کافی نہیں ہے۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ کتنے انسانوں تک ہم اسلام کے آب حیات کو پہنچانے میں ناکام رہے ہیں اور ہماری غفلت کی وجہ سے ابھی کتنے انسان ہدایت سے محروم ہیں۔

ساتھیوں کے تعاون اور آپ کے مشوروں سے ہم ترجمان القرآن کو زیادہ سے زیادہ موثر بنانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اب اسے نئے لوگوں تک بلکہ ہر ہر گھر تک پہنچنا چاہیے۔ ترجمان القرآن کے قارئین اور تحریک اسلامی کے کارکنوں کی ذمہ داری ہے کہ اس پیغام کو اپنی ذات اور اپنے گھر تک محدود نہ رکھیں بلکہ پوری کوشش کریں کہ یہ دوسروں تک پہنچے اور ان کے دلوں کو اللہ کے نور سے روشن کر دے۔ یہ کام آپ سے آپ نہیں ہو جائے گا۔ ایک منصوبے کے تحت اپنے اعزہ اور دوست احباب تک ہی نہیں بلکہ ہر اس انسان تک اس پیغام کو پہنچایئے جس تک آپ کی رسائی ہو سکتی ہے۔

ترجمان القرآن کی جانب سے اکتوبر تا دسمبر ۹۹ کی سہ ماہی میں اشاعت میں اضافہ کی خصوصی مہم چلائی جا رہی ہے۔ آپ کا فرض ہے کہ اس میں پورا حصہ لیں اور یہ کام صرف اللہ کی خوشنودی اور انسانیت کو دین کی روشنی پہنچانے کے جذبے سے کریں۔ پھر آپ دیکھیے' اللہ تعالیٰ اس میں کیسی برکت دیتا ہے اور راہ کی مشکلات کو کس طرح آسان بنا دیتا ہے۔

آیئے' ہم اور آپ مل کر کوشش کا حق ادا کر دیں اور جو اہداف ادارے نے سامنے رکھے ہیں ان کو حاصل کرنے کے لیے دامے' درمے' سخنے اور قدمے اپنی مساعی بروئے کار لائیں۔ السعی منا والاتمام من اللہ تعالیٰ۔

اشارات کے انگریزی ترجمے کے لیے دیکھیے : www.jamaat.org

فہم قرآن

اللہ کی پناہ چاہنا

تفسیر معوذتین

ابو سلیم محمد عبدالحیؒ ○

قرآن پاک کی آخری سورتوں کو معوذتین کہتے ہیں یعنی وہ سورتیں جن میں ہمیں استعاذہ کی تعلیم دی گئی ہے۔ "استعاذہ" عربی زبان کا لفظ ہے۔ پہلے اس کے معنی اچھی طرح سمجھ لیجیے۔ اس کے اندر بچنے' پناہ لینے' حفاظت میں آنے کا مفہوم پایا جاتا ہے' یا یوں کہیے کہ جس چیز سے آپ ڈرتے ہوں' اس سے بھاگ کر کسی ایسے کی پناہ اور حفاظت میں چلے جانا جو آپ کو اس سے بچا سکے۔ اسی کے مادے سے لفظ "اعوذ" نکلا ہے جس کا مطلب ہے کہ میں حفاظت میں آتا ہوں' پناہ لیتا ہوں۔ اس میں چھپ جانے اور چمٹ جانے کا بھی مفہوم ہے۔ یعنی جس چیز سے آپ کو خوف ہے' اس سے بچنے کے لیے آپ کسی کی آڑ لیں یا اس سے چمٹ جائیں۔ جیسے کوئی بچہ اس وقت بھاگ کر باپ کی آڑ لے لیتا ہے اور اس سے چمٹ جاتا ہے جب اس پر اس کا کوئی دشمن حملہ کرتا ہے۔

قرآن پاک میں ان دونوں سورتوں سے پہلے سورۂ اخلاص کو رکھا گیا ہے۔ سورۂ اخلاص میں یہ تعلیم دی گئی ہے کہ بندہ اپنا سب کچھ اللہ ہی کو سمجھے۔ بندگی ہو تو اس کی' اطاعت ہو تو اس کی' محبت ہو تو اس سے' خوف ہو تو اس سے' غرض یہ کہ زندگی کے ہر معاملے میں' بندے کی نظر اس پر رہے۔ بندہ اس سے امید لگائے' اس سے مانگے اور اسی کو اپنا آخری سہارا سمجھے۔ سورۂ اخلاص میں اللہ تعالیٰ کی ایک صفت "صمد" کا ذکر ہوا ہے۔ یعنی وہ ذات جسے کسی حالت میں کسی کی کوئی ضرورت نہ ہو' بلکہ اس کے برخلاف ہر چیز اس کی محتاج ہو۔ اس حقیقت کو سمجھ لینے کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ بندہ پناہ لے تو اللہ کی ہی لے' اور اس کی حفاظت کو اپنے لیے کافی سمجھے۔ اس کے سوا اگر بندہ کسی دوسرے کی پناہ لیتا ہے تو گویا وہ اپنے عمل

○ سابق مدیر' ماہنامہ الحسنات' لاہور

سے یہ ثابت کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے "صمد" ہونے کا یقین اس کے دل میں اچھی طرح بیٹھا نہیں ہے۔ چنانچہ ان دونوں سورتوں میں "استعاذہ" کی جو تعلیم دی گئی ہے وہ اس توحید کا لازمی تقاضا ہے جس کی تعلیم سورۂ اخلاص میں موجود ہے۔

انسان کا تعلق جب اللہ تعالیٰ سے کمزور ہو جاتا ہے یا اس بارے میں وہ کوئی غلط روش اختیار کر لیتا ہے تو وہ اللہ کے سوا دوسروں کی پناہ لیتا ہے اور مصیبتوں اور آفتوں سے بچنے کے لیے دوسروں کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ اس کی بے شمار شکلیں ہر دور میں موجود رہی ہیں۔ کچھ لوگوں نے تو صاف طور پر بہت سے خیالی معبودوں کو پناہ دینے والا اور مصیبتوں سے بچانے والا سمجھا، کچھ نے جنات سے یہ تعلق جوڑا، کسی نے مذہبی بزرگوں اور نیک لوگوں کو مشکل کشا اور دست گیر قرار دیا، کچھ لوگوں نے ٹوٹکوں کو مصیبت ٹالنے کا سبب جانا، کہیں نظربد سے بچنے کے لیے گنڈے، جھاڑ پھونک اور ٹونے اور ٹوٹکے ایجاد ہوئے، کہیں امراض کو آسیب اور جنات کا خلل سمجھ کر ان سے بچنے کے لیے طرح طرح کے جتن اختیار کیے گئے۔ اصحاب کہف اور ان کے کتے سے امیدیں لگائی گئیں، شہیدوں کی روحوں کی پناہ ڈھونڈی گئی اور اسی طرح کی نہ جانے کتنی باتیں اختیار کر لی گئیں، اور یہ یقین کر لیا گیا کہ اس طرح مصیبتیں ٹل سکتی ہیں اور بلاؤں سے نجات مل سکتی ہے۔ اسلام کی نظر میں یہ سب باتیں توحید کے اقرار کے خلاف ہیں اور اسلام ان سب کو مشرکانہ حرکات ہی قرار دیتا ہے۔

ایسی تمام باتوں کے متعلق مومن کے سوچنے کا ڈھنگ بالکل الگ ہوتا ہے، اس کا ایمان ہے کہ جو کچھ آتا ہے اللہ کی طرف سے آتا ہے۔ اس کی منشا اور ارادے کے بغیر یہاں کچھ نہیں ہو سکتا۔ وہ اگر نفع پہنچانا چاہے تو کوئی روک نہیں سکتا اور اگر اس کے حکم سے کوئی مصیبت آئے تو کوئی اسے ٹال نہیں سکتا۔ اس ایمان اور یقین کا تقاضا یہ ہے کہ مومن ہمیشہ اللہ کی پناہ ڈھونڈتا ہے، وہ صرف اس کی حفاظت کو کافی سمجھتا ہے اور ہر مصیبت کے وقت اس کا سہارا صرف اللہ ہوتا ہے۔ پھر یہ تو مادی تکالیف اور دنیوی مصیبتوں کا حال ہے۔ مومن کی نظر تو اس سے بہت آگے جاتی ہے۔ اس کی نگاہ میں سب سے بڑی مصیبت اور سب سے بڑی آفت یہ ہے کہ بندہ آخرت کی زندگی میں ناکامی سے دوچار ہو جائے۔ اس لیے وہ ان دنیوی مصیبتوں ہی کے لیے نہیں، بلکہ آخرت میں اس کے عذاب سے بچنے کے لیے بھی پناہ اور حفاظت کا محتاج ہے۔ مومن اچھی طرح جانتا ہے کہ آخرت میں اللہ کے عذاب اور اس کی پکڑ سے بچانے کے لیے کوئی سہارا اس کے سوا ممکن ہی نہیں کہ آدمی اللہ کی حفاظت کا مستحق ہو جائے اور اس کی پناہ میں آ جائے۔ چنانچہ جب وہ پناہ اور حفاظت کے لیے اللہ کی طرف رجوع کرتا ہے تو اس کی نظر میں آخرت بھی ہوتی ہے، اور وہ دنیا اور آخرت دونوں میں اللہ کی پناہ اور اس کی حفاظت طلب کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مومن ہر حال میں اپنے اللہ کا قرب تلاش کرتا ہے، اس کی طرف رجوع کرتا ہے، اس کی پناہ ڈھونڈتا ہے، اس کی

حفاظت میں اپنے آپ کو دے دینا چاہتا ہے' اسی سے تعلق جوڑتا ہے' اسی کے قدموں میں خود کو ڈالتا ہے' اسی کے آگے ہاتھ پھیلاتا ہے' اسی سے مانگتا ہے' اسی کے آگے گڑگڑاتا ہے' اسی کی عظمت اور بڑائی کو دل میں جگہ دیتا ہے' اور صرف اسی سے ڈرتا ہے۔ لفظ "اَعُوْذُ" میں یہ پوری کیفیت آجاتی ہے۔ بندہ جب کہتا ہے کہ اعوذ باللّٰہ "میں اللہ کی پناہ لیتا ہوں" تو اس فقرے میں وہ سب کیفیات آجاتی ہیں جن کی تفصیل اوپر بیان ہوئی۔ اعوذ باللّٰہ کہنے والا اپنے آپ کو بالکل اللہ کی حفاظت میں دے دینے کا اعلان کرتا ہے' ایسی حفاظت جو اسے دنیا اور آخرت دونوں جہان کی مصیبتوں سے بچانے کے لیے بالکل کافی ہو۔

ان دونوں سورتوں میں اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے ہمیں "استعاذہ" کی تعلیم دی ہے۔ ایسی جامع تعلیم کہ پھر اس کے بعد اس بارے میں ہمارے لیے کوئی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ آگے چل کر جب ان دونوں سورتوں کے الفاظ کی تشریح آپ کے سامنے آئے گی تو آپ محسوس کریں گے کہ اس مقصد کے لیے اس سے بہتر اور کوئی صورت ممکن ہی نہیں تھی۔

ان دونوں سورتوں کی یہی اہمیت اور ان کے مضامین کی یہی وسعت ہے جس کی بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے پڑھنے کی تاکید فرمائی ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ایک صحابی حضرت عقبہؓ سے فرمایا کہ کیا میں تمھیں یہ نہ بتا دوں کہ پناہ چاہنے والوں کے لیے پناہ چاہنے کا سب سے بہتر طریقہ کیا ہے؟ انھوں نے کہا' ضرور! تو آنحضرتؐ نے ارشاد فرمایا: "قُل اَعُوذ برب الفلق اور قُل اَعُوذ برب النّاس پڑھا کرو"۔ ترمذی میں آتا ہے کہ حضرت عقبہ بن عامرؓ نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے حکم دیا کہ میں ہر نماز کے بعد معوذتین پڑھا کروں۔ ترمذی' نسائی اور سنن ابوداود میں آتا ہے کہ حضرت عبداللہ بن حبیبؓ نے فرمایا کہ ایک بار ہم بارش والی اندھیری رات میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تلاش میں نکلے تاکہ حضورؐ ہمیں نماز پڑھائیں۔ حضورؐ مل گئے۔ حضورؐ نے ارشاد فرمایا "کہو"۔ لیکن میں نے کچھ نہ کہا۔ حضورؐ نے پھر ارشاد فرمایا "کہو"۔ میں پھر بھی کچھ نہ بولا۔ تب حضورؐ نے پھر ارشاد فرمایا "کہو"۔ تو میں نے عرض کیا: "کیا کہوں؟" فرمایا: "کہو قل ھو اللّٰہ احد' اور معوذتین' تین تین بار شام کے وقت اور صبح کے وقت' تمھارے لیے ہر موقع اور ہر ضرورت کے لیے کافی ہے"۔

بخاری اور مسلم میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب بستر پر تشریف لے جاتے تو قل ھو اللّٰہ احد اور معوذتین پڑھ کر دونوں ہتھیلیوں پر پھونکتے اور پھر دونوں ہاتھ اپنے چہرے پر اور جسم پر جہاں تک ہاتھ جا سکتا' پھیر لیتے۔

ان تمام احادیث سے یہ واضح ہوتا ہے کہ ان سورتوں کا پڑھتے رہنا نہایت ضروری ہے اور اس سے پڑھنے والے کو بہت فائدہ حاصل ہو سکتا ہے' بالخصوص جب انسان کسی زحمت میں مبتلا ہو تو اس وقت ان کا ورد کرنا

بہت مفید ہو سکتا ہے۔ لیکن اس کے لیے شرط یہی ہے کہ انسان انھیں سوچ سمجھ کر پڑھے اور ذہن سے ان تمام باتوں کو نکالے جو ان سورتوں کے مضمون کے خلاف ہوں' اور ایسے کاموں سے بچے جن سے اللہ ناخوش ہوتا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ یہ دونوں سورتیں اپنے مضمون کے اعتبار سے مومن کے لیے اتنی ضروری ہیں کہ زندگی کی ۔دی ضروریات کھانے پینے' اور لباس کا درجہ بھی ان کے بعد ہی آتا ہے۔

آگے بڑھنے اور ان سورتوں کے مضامین پر تفصیل کے ساتھ غور کرنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس سلسلے کی چند اور باتیں واضح کر دی جائیں۔

پناہ چاہنے کا جو مفہوم ہے وہ تو ایک حد تک آپ کے سامنے آ چکا' اب یہ اور سمجھ لیجیے کہ انسان جس کی پناہ چاہتا ہے اس کے بارے میں اس کا تصور کیا ہوتا ہے' اور کیا ہو سکتا ہے؟ ظاہر ہے کہ آدمی اسی سے پناہ چاہے گا جس کے بارے میں اسے یہ یقین ہو کہ وہ اسے اس مصیبت سے بچانے کی قدرت رکھتا ہے۔ اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ یہ قدرت صرف اللہ تعالیٰ میں ہے' اسی لیے ان سورتوں میں پناہ چاہنے کی تعلیم کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ کی ان صفات کا ذکر ہوا ہے جو کسی پناہ دینے والے کے لیے ضروری ہیں۔ یعنی رب الفلق' رب الناس' ملکَ الناس اور الٰہ الناس۔ ان صفات کی تشریح آگے اپنے موقع پر آ رہی ہے۔ ان صفات کا ذکر کر کے انسان کے ذہن میں یہ بات بٹھائی گئی ہے کہ صرف وہی ذات جس میں یہ صفات پائی جائیں اس قابل ہے کہ پناہ چاہنے والے اس کی پناہ چاہیں' وہی انھیں مصیبتوں سے بچا سکتی ہے اور جب تک کسی میں یہ صفات نہ ہوں' اس سے یہ امید لگانا کہ وہ پناہ دے سکتا ہے' صحیح نہیں۔

تیسری بات جو اس سلسلے میں سمجھ لینے کی ہے' یہ ہے کہ وہ چیزیں جن سے پناہ چاہی جائے کیا ہو سکتی ہیں؟ بہت سی چیزیں تو وہ ہیں جن کا آفت اور مصیبت ہونا ہر شخص جانتا ہے' اور ان سے بچنے کے لیے اس کے اندر فطری طور پر ایک جذبہ موجود ہے۔ مثلاً بیماری' افلاس' کسی دشمن کا خوف یا اور آفتیں جن سے انسان دوچار ہوتا رہتا ہے۔ لیکن مومن کی نظر میں سب سے بڑی آفت وہ گناہ ہیں جو اسے اللہ کی رحمت سے دور کرتے ہیں اور اس کے عذاب کا مستحق بناتے ہیں۔ ان سورتوں میں اس سے پناہ مانگنے کی بھی تعلیم دی گئی ہے۔ پہلی سورہ میں جن چیزوں سے پناہ چاہنے کا ذکر ہوا ہے ان کی تشریح تو آگے آئے گی۔ یہ سب ایسی چیزیں ہیں جو خارج میں پائی جاتی ہیں۔ دوسری سورہ میں ان آفتوں سے پناہ چاہنے کی تلقین کی جا رہی ہے جو انسان کے اندر پائی جاتی ہیں' اور اس کے ذہن اور فکر کو متاثر کرتی ہیں۔

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ ○ مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ ○ وَمِنْ شَرِّ غَاسِقٍ اِذَا وَقَبَ ○ وَمِنْ شَرِّ النَّفّٰثٰتِ فِی الْعُقَدِ ○ وَمِنْ شَرِّ حَاسِدٍ اِذَا حَسَدَ ○

کہو کہ میں پناہ لیتا ہوں صبح کے مالک کی، ہر اس چیز کی برائی سے جو اس نے پیدا کی، اور اندھیری رات کی برائی سے جب وہ چھا جائے۔ اور گنڈوں پر پھونکنے والیوں کی برائی سے۔ اور حسد کرنے والے کی برائی سے جب وہ حسد کرنے لگے۔

اس سورہ میں یہ تعلیم دی گئی ہے کہ بندہ جب بھی پناہ لے تو صرف اللہ کی پناہ لے۔ اور اللہ کا ذکر یہاں اس کی اس صفت کے ساتھ کیا گیا ہے کہ وہ رب الفلق ہے۔ فلق کے معنی ہیں پھاڑنا، اسی نسبت سے صبح کو بھی فلق کہتے ہیں۔ کیوں کہ جب رات کی سیاہی پھٹتی ہے تو دن کی روشنی ظاہر ہوتی ہے بلکہ فلق کے لفظ سے تمام ہی مخلوقات مراد لی جاتی ہیں۔ کیوں کہ ہر چیز کی پیدایش میں کسی نہ کسی طرح پھٹنے کا عمل موجود ہے۔ مثلاً ہر دانہ اور ہر گٹھلی جب پھٹتی ہے تو اکھوا باہر آتا ہے، اور اکھوے کو پودے کی شکل میں آنے کے لیے زمین کا پھٹنا نئی پیدایش کے لیے ضروری ہے۔ اسی طرح انڈے کا پھٹنا، اور رحم کے اندر مختلف جھلیوں اور پردوں کا پھٹنا نئی پیدایش کے لیے ضروری ہے۔ اس طرح صرف ایک لفظ رَبِّ الْفَلَقِ کہہ کر یہ حقیقت ہمارے ذہنوں کے سامنے واضح کر دی گئی کہ تمھیں جس ذات کی پناہ لینے کی تعلیم دی جا رہی ہے وہ، وہ ذات ہے جس کے حکم سے رات اور دن ہو رہے ہیں۔ صبح کا نمودار ہونا دراصل اس پورے نظام کی ایک بہت نمایاں علامت ہے جس کے ماتحت ہماری زمین گردش کر رہی ہے۔ تو وہ ذات وہ ہے جو اس پورے نظام کی مالک ہے اور جس کے حکم سے یہ پوری کائنات اور اس کا نظام قائم ہے۔ پھر اس کرہ پر جو کچھ پیدا ہو رہا ہے اس سب کا مالک بھی وہی ہے، اسی کے حکم سے دانے اور گٹھلیاں پھٹتی ہیں، اور زمین سے نباتات اگتی ہیں، اور اسی کے حکم سے ہر جان دار کی پیدایش کا سلسلہ جاری ہے۔ تو بھلا جو ذات ایسی ہو اس کی پناہ لے لینے کے بعد یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اس زمین اور آسمان کے اندر کوئی چیز بھی ایسی باقی رہ سکے جو اپنے طور پر کسی کو کوئی نقصان پہنچانے کی قدرت رکھتی ہو؟ یہاں تو جو کچھ ہے وہ سب اسی کا پیدا کیا ہوا ہے، اور اسی کے حکم میں ہے۔ تو اگر ہم یہاں مختلف چیزوں کی برائیوں سے بچنا چاہتے ہیں تو کیوں نہ اس ذات کی پناہ لیں جس کے قبضے میں سب کچھ ہے، اور جو سب کا پیدا کرنے والا ہے؟ اس طرح ایک چھوٹا سا فقرہ رَبِّ الْفَلَقِ کہہ کر ہمیں یہ بتا دیا گیا کہ ہم کیوں سب کی طرف سے نظریں ہٹا کر اپنے آپ کو صرف اللہ کی پناہ میں دے دیں اور کیوں اس کے علاوہ نہ کسی سے خوف کھائیں اور نہ کسی کی برائی سے بچنے کے لیے کسی اور کی پناہ لیں۔

اس سورہ میں جن چیزوں کے شر یا برائی سے بچنے کے لیے اللہ کی پناہ لینے کی تاکید کی گئی ہے ان میں سب سے پہلے شَرِّ مَا خَلَقَ کا ذکر فرمایا گیا ہے یعنی ہر اس چیز کی برائی جو اللہ نے پیدا فرمائی ہے۔ یہ ایک ایسا فقرہ ہے کہ اس میں تمام ہی چیزیں شامل ہیں اور اس سے باہر کسی چیز کا امکان ہی نہیں، کیوں کہ یہاں جو کچھ ہے وہ سب اللہ کا پیدا کیا ہوا ہی ہے۔ یہاں یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ بعض چیزیں تو ایسی ہیں جن کا شر

ظاہر ہوتا ہے اور ہم سب اسے جانتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ وہ ہمیں تکلیف پہنچاتی ہیں یا ہمارے لیے غم اور الم کا سبب بنتی ہیں۔ لیکن بہت سی چیزیں ایسی بھی ہیں جن میں ہمیں بظاہر کوئی شر نظر نہیں آتا لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان میں بھی شر کا پہلو موجود ہے۔ اور ہمارے لیے ضروری ہے کہ ہم ان چیزوں کے شر سے بھی بچنے کے لیے اللہ کی پناہ لیں۔ یہ بات چند مثالوں سے سمجھ میں آسکتی ہے۔

ایک ایسے کھانے کا تصور کیجیے جو انتہائی لذیذ ہے اور بھوک کے وقت جب ہم اسے کھاتے ہیں تو انتہائی خوشی محسوس کرتے ہیں' لیکن اگر اسی کھانے میں زہر ملا ہو تو ظاہر ہے کہ ہم اس کے شر سے بچ نہیں سکتے' اور وہی مزے دار کھانا ہمارے لیے موت کا پیغام ثابت ہوتا ہے۔ یہی حال گناہوں کا ہے' ان میں عام طور پر لذت ہوتی ہے لیکن اپنے نتیجے کے اعتبار سے وہ ہمارے لیے مہلک ہوتے ہیں۔ کبھی تو ان کی وجہ سے مصیبت اور تکلیف اسی دنیا ہی میں جھیلنا پڑ جاتی ہے' ورنہ یہ تو یقینی ہے کہ ان کا برا انجام ایک دن ضرور سامنے آئے گا' اور اس ہمیشہ رہنے والی زندگی میں یہی کام جو آج بڑے مزے دار معلوم ہوتے ہیں ہمارے لیے انتہائی مصیبت اور رنج کا سبب بنیں گے۔

اسی طرح دولت اور مال کو لیجیے۔ بظاہر یہ ہمارے لیے راحت' آرام اور خوشی کا موجب ہے لیکن اگر دولت پا کر ہم ایسے کام کرنے لگیں جو خدا کی ناخوشی کا سبب بنتے ہیں تو یہ دولت ہمارے لیے شر کا سبب ہو سکتی ہے۔ یہی حال فقر و فاقہ کا بھی ہے۔ غریبی اور تنگی میں مبتلا ہو کر اگر کوئی شخص صبر سے کام نہیں لیتا' اور کوئی ایسا کام کرنے لگتا ہے جو خدا کی ناخوشی کا سبب ہو' مثلاً اللہ تعالیٰ کی جناب میں شکوہ و شکایت کرنا' یا اپنی غریبی اور مفلسی کو بہانہ بنا کر حرام طریقے پر مال حاصل کرنا' یا اسی طرح کے اور کام' تو یہ اسی فقر و فاقہ کی حالت کا شر ہے۔

اسی طرح اگر آپ غور کریں گے تو ہر بات میں شر کا اندیشہ موجود پائیں گے یہاں تک کہ وہ کام جو خالص دینی کام سمجھے جاتے ہیں' ان میں بھی شر کا پہلو موجود ہے۔ آپ کسی دینی موضوع پر ایک تقریر کرتے ہیں یا کوئی مضمون لکھتے ہیں لیکن اگر اس کی غرض شہرت ہو' اور آپ کی نیت محض دنیوی نفع حاصل کر لینا ہو تو یہی پہلو شر کا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب نیا لباس تبدیل فرماتے تو اس کے شر سے بچنے کے لیے بھی اللہ کی پناہ لیتے۔ نیا لباس پہن کر ہو سکتا ہے کہ آدمی غرور کرنے لگے اور اللہ کا شکر ادا کرنے کے بدلے اس کے نفس میں خراب خیالات آنے لگیں' بس یہی شر کا پہلو ہے۔ غرض یہ کہ ہر کام اور ہر بات میں ایک ایسا پہلو موجود ہے جو اسے نتیجے کے اعتبار سے شر بنا سکتا ہے۔ آپ کا کاروبار' آپ کی کھیتی باڑی' آپ کی روزی کمانے کے حلال طریقے' بیوی بچوں کے ساتھ معاملہ' عزیزوں اور دوستوں سے ملنا جلنا' آپ کی بات چیت' غرض یہ کہ ہر نقل و حرکت اور آپ کے ہر کام میں ایسے پہلو موجود ہیں جو نتیجے کے اعتبار سے اسے شر بھی بنا سکتے ہیں۔

اب ذرا خیال کیجیے کہ یہ کمزور انسان جس کے ساتھ نفس اور شیطان لگا ہوا ہے' اور ہر وقت اس بات کا ڈر ہے کہ وہ کسی نہ کسی شر کا شکار ہو جائے' کس طرح اپنے کو شر سے بچا سکتا ہے۔ کون سی طاقت ایسی ہے جو ہر وقت اس کا ہاتھ پکڑ سکے؟ اور کون سا سہارا ایسا ہے جو اسے ہر وقت شر سے بچا سکے؟ اسی کے لیے مجبوراً انسان کو ہر وقت اللہ کی پناہ کی ضرورت ہے۔ اس کی مدد اور اس کے فضل کے بغیر وہ ہرگز شر سے بچ نہیں سکتا۔ ہر وقت اس بات کا ڈر ہے کہ وہ کسی نہ کسی شر کا شکار ہو جائے۔ اس طرح آپ محسوس کریں گے کہ اللہ کی پناہ لینے کی جو تعلیم دی گئی ہے وہ کس قدر ضروری ہے۔ اس کے بغیر انسان ہر وقت خطرے میں ہے۔

اس کے علاوہ شَرِّ مَا خَلَقَ میں وہ تمام شر شامل ہیں جنھیں ہم عام طور پر شر کہتے ہیں۔ مثلاً حیوانوں کے شر' انسانوں اور جنوں کے شر' کیڑے مکوڑوں اور دوسری اذیت دینے والی چیزوں کے شر۔ بیماریاں' آندھیاں' بجلیاں اور اسی طرح کی تمام آفات آسمانی و زمینی سب ہی اس میں شامل ہیں۔

دوسری چیز جس کے شر کا ذکر اس سورہ میں کیا گیا ہے وہ شَرِّ غَاسِقٍ اِذَا وَقَبَ ہے۔ غاسق' اندھیری رات کو کہتے ہیں اور جب اندھیری رات اچھی طرح پھیل جاتی ہے تو اس کا شر بھی بڑھ جاتا ہے۔ رات کے پردے میں طرح طرح کی برائیاں چھپی ہوتی ہیں۔ کہیں رات جان اور مال کے لیے خطرہ بن کر آتی ہے' اور کہیں شیطانی کاموں کے لیے آسانیاں فراہم کرتی ہے۔ رات کے شر کا تصور ہر زمانے اور ہر مقام کے لحاظ سے الگ الگ کیا جا سکتا ہے۔

تیسری چیز جس کے شر کا ذکر اس سورہ میں ہے' وہ گنڈوں [گرہوں] پر پھونکنے والیوں کا شر ہے۔ اس سے مراد جادو ہے۔ جادو کرنے والی عورتیں اور مرد کچھ ناپاک روحوں اور شیاطین کی مدد سے ایسے عملیات کرنے لگتے ہیں جن سے دوسروں کو نقصان پہنچایا جا سکے۔ ایسی چیزوں کے شر سے بچنے کے لیے کچھ لوگ عاملوں کی طرف رجوع کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ جادو کا توڑ جادو سے کیا جائے۔ اس سورہ میں ہمیں یہ تعلیم دی جا رہی ہے کہ اس قسم کے شر سے بچنے کے لیے عملیات کا سہارا لینا درست نہیں' بلکہ مومن کے لیے صحیح طریقہ صرف ایک ہے کہ وہ اللہ کی پناہ چاہے' اور ان چیزوں کے شر سے بچنے کے لیے صرف اسی کی پناہ ڈھونڈے۔

چوتھی چیز جس کے شر کا ذکر کیا گیا ہے وہ حسد کرنے والے کا حسد ہے۔ حسد دل کی اس کیفیت کا نام ہے کہ ایک شخص دوسرے کے پاس اللہ کی کسی نعمت کو دیکھے تو اسے دیکھ کر دل میں کڑھے اور یہ چاہے کہ یہ نعمت اس سے چھن جائے یا اس کے بدلے مجھے مل جائے۔ دل کی یہ بیماری دراصل ذہن کی ایک بڑی خرابی کا پتا دیتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ حسد کرنے والا یہ نہیں مانتا کہ اللہ تعالیٰ کا فضل بہت وسیع ہے۔ کیونکہ اگر وہ یہ مانتا تو وہ یہ خواہش بھی کر سکتا تھا کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے اسے نعمت سے نوازا ہے' وہ مجھے بھی عطا کرے۔ پھر یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ حسد کرنے والا اللہ تعالیٰ کی حکمت' تدبیر اور رحمت پر ایمان نہیں رکھتا' ورنہ اسے یہ سمجھنا چاہیے تھا کہ یہ اس کی حکمت' تدبیر اور رحمت کا تقاضا ہے کہ اس نے اپنے کسی بندے کو اپنی کسی نعمت سے نوازا'

ہے۔ ذہن کی اس خرابی کی وجہ سے انسان کے دل میں کینہ پیدا ہوتا ہے اور پھر اس کے نتیجے میں وہ ایسی تدبیریں سوچنے لگتا ہے جن سے کام لے کر وہ اس شخص کو نقصان پہنچائے جسے اللہ نے اپنی نعمتیں دی ہیں۔ یہ جذبہ انسان کو مجبور کرتا ہے کہ وہ اپنے حسد کی آگ کو بجھانے کے لیے دوسرے کو برباد کرنے کی صورتیں پیدا کرے۔

حسد کی یہ بیماری دل کی بدترین بیماریوں میں سے ایک ہے۔ سب سے پہلے تو ہمیں اس پر نظر رکھنا چاہیے کہ اس ناپاکی کا کوئی حصہ خود ہمارے دل میں گھسنے نہ پائے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ ہم ہمیشہ یہ بات اپنے ذہن میں تازہ رکھیں کہ اصل دینے والا صرف اللہ ہے۔ جس کسی کو جو کچھ ملا ہے' اسی سے ملا ہے اور جس کسی کو جو کچھ نہیں ملا ہے وہ اسی کے منشا اور حکمت کے تحت ہے۔ جب اللہ کی قدرت اور حکمت کے بارے میں انسان کا ایمان کمزور ہوتا ہے' اسی وقت اس کے دل میں حسد کی بیماری پیدا ہوتی ہے۔ اللہ پر صحیح ایمان رکھنے والا تو یہ جانتا ہے کہ اللہ نے جو کچھ کسی کو دیا ہے اس میں بھی اس کی آزمایش اور امتحان ہے' اور جس کسی کو محروم رکھا ہے اس میں بھی آزمایش اور امتحان ہے۔ حسد سے بچنے کے لیے سب سے زیادہ مفید تدبیر یہ ہی ہے کہ آدمی اپنے ایمان کو تازہ کرے۔ اسی سے صحیح فکر پیدا ہوتی ہے اور آدمی دل کی بیماریوں سے محفوظ رہتا ہے۔

جہاں تک دوسروں کے حسد کرنے کا تعلق ہے اس کے بارے میں ہمیں اس سورہ میں یہ تعلیم دی گئی ہے کہ ہم اس کے شر سے بچنے کے لیے اللہ کی پناہ کو کافی سمجھیں' اور ہر وقت اسی سے یہ لو لگائیں کہ جب اس نے ہمیں اپنی نعمتوں سے نوازا ہے تو وہ ہمیں ان لوگوں کے شر سے بھی محفوظ رکھے جو اللہ کی دی ہوئی نعمتوں کو دیکھ کر جلتے ہیں اور ہمیں نقصان پہنچانے کے درپے ہوتے ہیں۔ عام طور پر جب ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی شخص ہمارے پاس اللہ کی کسی نعمت کو دیکھ کر جل رہا ہے اور وہ ہمارا برا چاہ رہا ہے تو ہمارے دل میں اس کے خلاف نفرت اور انتقام کے جذبات پیدا ہوتے ہیں' ایسے جذبات سے دل کو خالی رکھنے کی کوشش کرنا چاہیے اور اس شخص کا معاملہ اللہ کے سپرد کرتے ہوئے اس کے شر سے محفوظ رہنے کے لیے اللہ کی پناہ لینا چاہیے۔ یہی بات ہمیں اس سورہ میں سکھائی گئی ہے۔

اللہ کی نعمتوں کا تصور کرتے ہوئے سب سے پہلے ہماری نظر میں مادی نعمتیں آتی ہیں مثلاً مال و دولت' اولاد' منصب اور اقتدار وغیرہ۔ لیکن مومن کی نظر میں ان تمام نعمتوں سے بڑھ کر ایمان اور عمل صالح کی نعمت ہے۔ اس نعمت کو دیکھ کر جلنے والا انسان کا سب سے بڑا دشمن ہے۔ جب وہ کسی بندے کو ایمان اور عمل صالح کی دولت سے مالا مال دیکھتا ہے تو سخت بے چینی محسوس کرتا ہے اور چاہتا ہے کہ کسی طرح یہ نعمت چھن جائے۔ اس کے لیے وہ بے شمار چالیں چلتا ہے اور ایک بندۂ مومن کے لیے ہر وقت اس بات کا اندیشہ موجود ہے کہ وہ شیطان کی کسی چال کا شکار ہو جائے اور خدانخواستہ اللہ کی اس سب سے بڑی نعمت سے محروم ہو جائے۔ مومن کو سب سے زیادہ یہی نعمت عزیز ہے' کیوں کہ یہ اپنے نتیجے کے اعتبار سے ان ہمیشہ رہنے والی نعمتوں کا ذریعہ بن سکتی ہے جو آخرت میں اسے ملیں گی۔ اسی لیے مومن کے لیے ضروری ہے کہ وہ ایک طرف تو اس نعمت کو باقی رکھنے اور بڑھانے کی فکر میں لگا رہے اور دوسری طرف وہ ہر وقت اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا رہے کہ وہ اسے ان

نعمتوں کو دیکھ کر جلنے والے شیطان کے شر سے محفوظ رکھے۔ حسد کرنے والوں میں بدترین حسد کرنے والا شیطان ہی ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ ○ مَلِكِ النَّاسِ ○ اِلٰهِ النَّاسِ ○ مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ الْخَنَّاسِ ○ الَّذِیْ یُوَسْوِسُ فِیْ صُدُوْرِ النَّاسِ ○ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ ○

کہو کہ میں پناہ لیتا ہوں لوگوں کے رب کی' لوگوں کے بادشاہ کی' لوگوں کے الٰہ کی' اس کے شر سے' جو بہکاتا اور چھپ جاتا ہے' جو لوگوں کے دلوں میں وسوسہ ڈالتا ہے' چاہے وہ جن ہو یا انسان۔

۱۔ اس سورہ میں بھی یہی تعلیم دی گئی ہے کہ بندہ صرف اللہ کی پناہ لے۔ یہاں اللہ کی تین صفتوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ ایک یہ کہ وہ تمام لوگوں کا رب ہے۔ دوسرے یہ کہ وہ تمام لوگوں کا مالک اور بادشاہ ہے' اور تیسرے یہ کہ وہ تمام لوگوں کا الٰہ ہے۔ جو شخص اللہ تعالیٰ کو ان صفات کے ساتھ مانتا ہے وہ تو اس بات کا تصور بھی نہیں کر سکتا کہ اسے چھوڑ کر وہ کسی دوسرے کی پناہ لے۔ کیونکہ جس کے بارے میں ہمارا یہ ایمان ہو کہ وہی ہمیں پال رہا ہے' ہماری دیکھ بھال کر رہا ہے' اور ہمارے تمام کاموں کا بنانا اسی کے ہاتھ میں ہے' اور ہمیں جس چیز کی بھی ضرورت ہے' وہ وہی فراہم کر رہا ہے' وہی ہماری حفاظت کر رہا ہے' وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے' ہماری دعائیں سنتا ہے اور ہماری مصیبتیں دور کرتا ہے' تو بھلا اس ایمان اور یقین کے بعد کسی دوسرے کی پناہ لینے کا سوال ہی کب پیدا ہوتا ہے؟

اسی طرح اس کی دوسری صفت پر غور کیجیے۔ جب ہم اسے بادشاہ مانتے ہیں تو اس کا مطلب یہی تو ہے کہ سارے معاملات کی باگ ڈور اس کے ہاتھ میں ہے' ہم اس کے بندے اور غلام ہیں' ہمارے معاملات وہ جس طرح چاہتا ہے طے فرماتا ہے۔ سارے اختیارات اس کے ہاتھ میں ہیں' اور وہی بادشاہی اور حکمرانی کا مستحق ہے' اور اسی لیے ہر مصیبت کے وقت ہم اسی سے مدد مانگتے ہیں' اسی کو پکارتے ہیں۔ اس یقین اور ایمان کے بعد کسی دوسرے کی پناہ لینا کیسے ٹھیک ہو سکتا ہے؟

یہی حال تیسری صفت کا ہے۔ وہ ہمارا الٰہ ہے۔ ہمارا ایمان ہے کہ ہماری تمام حاجتیں وہی پوری کرتا ہے اور مصیبتوں اور خطروں کے وقت وہی ہمیں پناہ دیتا ہے' بے چینی میں سکون عطا فرمانا اسی کا کام ہے' اور اسی لیے وہی اس کا مستحق ہے کہ ہم اس کی عبادت کریں' اس کے آگے سر جھکائیں' ہاتھ باندھ کر کھڑے ہوں اور اسی کے لیے اپنی نذر و نیاز پیش کریں۔ تو اب یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ہم ایک ذات کے بارے میں یہ عقیدہ بھی رکھیں اور پھر اسے چھوڑ کر کسی دوسرے کی پناہ لینے لگیں۔

۲۔ اس سورہ میں جس چیز سے پناہ چاہنے کی تعلیم دی گئی ہے وہ بڑی اہم ہے' کیونکہ اسی کی وجہ سے

انسان گناہ میں مبتلا ہوتا ہے' اور ظاہر ہے کہ جو چیز انسان کو گناہ میں مبتلا کرے اس سے بڑا شر اور کس چیز کا ہو سکتا ہے؟ گناہ ہی تو انسان کو دنیا اور آخرت کی مصیبتوں میں ڈالتا ہے۔

اس سے پہلی سورہ میں جن چیزوں کے شر سے پناہ لینے کی تعلیم دی گئی تھی' وہ خارج میں پائی جاتی ہیں۔ مثلاً کسی دوسرے کا ظلم' کسی چیز سے پہنچنے والی تکلیف' جادو یا حسد وغیرہ۔ لیکن اس سورہ میں اس چیز کے شر سے بچنے کا ذکر ہے جو کہیں باہر نہیں' بلکہ خود ہمارے اندر پائی جاتی ہے۔ پھر یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ پہلی سورہ میں جن چیزوں کے شر سے بچنے کا ذکر ہے ان کے سلسلہ میں آدمی مجبور ہے۔ وہ شر اگر اسے پہنچ جائیں تو خود اس پر کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی۔ اس کے برخلاف اس سورہ میں جس شر سے بچنے کی تلقین کی گئی ہے اس میں اگر کوئی شخص مبتلا ہو جاتا ہے تو اس کی ذمہ داری خود اسی شخص پر آتی ہے۔ نفس کی جن خرابیوں اور برائیوں میں ہم مبتلا ہوتے ہیں' ان سے پہنچنے والی شر کی ذمہ داری سے ہم کیسے بچ سکتے ہیں؟

۳۔ اس سورہ میں جس چیز کے شر سے بچنے کی تعلیم دی گئی ہے وہ اَلْوَسْوَاسِ الْخَنَّاسِ ہے۔ وسواس اسے کہتے ہیں جو وسوسہ ڈالے۔ وسوسہ دل میں آنے والے برے خیال کو کہتے ہیں۔ شیطان کا کام یہی بتایا گیا ہے کہ وہ انسان کے دل میں برے خیالات ڈالا کرتا ہے۔ خود انسان کا نفس بھی ایسے خیالات کا سبب بنتا ہے۔ ان ہی کو وسوسہ کہتے ہیں۔ یہاں اس طرح وسوسہ ڈالنے والے کی صفت خنّاس آئی ہے۔ خنّاس اسے کہتے ہیں جو ظاہر ہو اور چھپ جائے۔ ان وسوسوں کی حیثیت بھی کچھ ایسی ہی ہوتی ہے' آپ کے دل میں ایک وسوسہ آتا ہے' اگر آپ فوراً اللہ کو یاد کریں' یا اس سے پناہ چاہیں تو وہ فوراً غائب ہو جاتا ہے' جیسے کوئی چھپا ہوا سانپ بل سے منہ نکالے اور پھر فوراً دبک جائے۔ اور پھر جب اللہ کے ذکر سے آپ کا دل غافل ہو جاتا ہے تو پھر وہ وسوسہ آنے لگتا ہے۔ اسی بار بار چھپنے اور ظاہر ہونے والے کو خنّاس کہتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے شیطان کو یہ اختیار دیا ہے کہ وہ بندے کے دل میں وسوسہ ڈال سکے' لیکن اسے یہ اختیار حاصل نہیں ہے کہ وہ بندے سے کوئی غلط کام کرا بھی لے۔ دل میں برا خیال آنے کے بعد بندے کو اختیار حاصل ہے کہ وہ چاہے تو اس خیال کے مطابق برائی میں مبتلا ہو جائے اور چاہے تو بچ جائے۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے یہاں دل میں برا خیال آنے پر کوئی گرفت نہیں ہے۔ خیال کے مطابق عمل کرنے پر پکڑ ہو گی (آسان تفسیر' ص ۴۶۸ - ۴۸۰)۔

راکھ کا ڈھیر

ان کی نظر فریب تہذیب
ان کا شاندار تمدن
ان کی حیرت انگیز صنعتیں
ان کی زبردست سلطنتیں
ان کی عالی شان یونی ورسٹیاں
ان کے علوم و فنون اور
ادب لطیف و کثیف کے اتھاہ ذخیرے

حتیٰ کہ.......
ان کی عبادتیں اور ظاہری نیکیاں
اور ان کے بڑے بڑے رفاہی و خیراتی کارنامے بھی
جس پر وہ دنیا میں فخر کرتے ہیں'

سب کے سب آخرکار راکھ کا ایک ڈھیر ہی ثابت ہوں گے
جسے یوم قیامت کی آندھی بالکل صاف کر دے گی اور
عالم آخرت میں ایک ذرہ بھی ان کے پاس اس لائق نہ رہے گا کہ
اسے خدا کی میزان میں رکھ کر
کچھ وزن پاسکیں

(تفہیم القرآن ۲/ص ۴۷۹)

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا :
”تم میں سے جب کسی کا ملازم گرمی اور دھواں برداشت کر کے کھانا وغیرہ تیار کر کے لائے تو اس شخص کو چاہیے کہ اس ملازم کو بھی اپنے ساتھ کھانے پر بٹھائے اور ملازم بیٹھ کر کھالے، احساس کمتری میں مبتلا نہ ہو۔ اور اگر کھانے کی چیز کم ہو تو بھی کم از کم ایک دو لقمے تو ضرور ہی اس کے ہاتھ پر رکھ دے“۔ (مشکوٰۃ مسلم)

مؤثر تنظیم

استحکام اور توسیع کے تقاضے

خرم مرادؒ

دین کے لیے منظم جدوجہد ضروری ہے۔ اس بات پر یقین تحریک اسلامی کی بنیاد ہے۔ وہ تنظیم جو تحریک اسلامی کے مقاصد کے حصول' اقامت دین اور جہاد کے لیے قائم کی گئی ہو' زیادہ سے زیادہ مؤثر کیسے بنائی جائے' یہ ایک وسیع اور اہم موضوع ہے۔

مؤثر تنظیم (effective organisation) کے کیا معنی ہیں؟ یا مؤثر تنظیم سے کیا مراد ہے؟ یہ وہ بنیادی سوال ہے جس کا جواب دیا جانا چاہیے۔

تنظیم کیا کرتی ہے؟ آیئے پہلے اس پر تھوڑا سا غور کرتے ہیں۔

تنظیم مختلف افراد کو جمع کر کے ایک ایسا مجموعہ بناتی ہے جس کے ذریعے وہ کام کیا جا سکے کہ جو ہر فرد الگ الگ نہیں کر سکتا۔ نیز اس کے اندر اتنی قوت پیدا کرتی ہے جو صرف افراد کے مجموعے سے حاصل نہیں ہو سکتی۔ اگر اسے ہم ایک معروف مثال کے ذریعے سمجھنا چاہیں تو یوں کہہ سکتے ہیں کہ تنظیم ایک جمع ایک [1+1] کر کے صرف دو نہیں بناتی بلکہ گیارہ بناتی ہے۔ یہ صرف صلاحیتوں کو جمع نہیں کر دیتی بلکہ ان کو ضرب (multiply) کرتی ہے' ان کے اندر کئی گنا زیادہ اضافہ کرتی ہے۔ یہ وہ کام ہیں جو ایک تنظیم کرتی ہے۔ اگر چند افراد مل کر کوئی بڑا کام سرانجام نہ دے سکیں اور دس افراد کی مجموعی قوت بھی پانچ یا دس افراد کے برابر رہے تو پھر اس کے معنی یہ ہوں گے کہ تنظیم مؤثر نہیں ہے۔

دوسرا سوال' پہلے سوال کے ضمن میں یہ ہے کہ "مؤثر" کے معنی کیا ہیں؟ "مؤثر" کے معنی دراصل یہ ہیں کہ جو مقصد کسی تنظیم کے پیش نظر ہو' اس کا حصول تیز رفتاری کے ساتھ ممکن ہو سکے۔ اگر افراد جمع ہو جائیں' تنظیم بن جائے' دفاتر قائم ہو جائیں' عہدیدار اپنی ذمہ داریاں سنبھال لیں لیکن مقصد کی طرف پیش رفت نہ ہو اور مقصد حاصل نہ ہو سکے' تو پھر تنظیم تو موجود ہو گی لیکن ہم کہیں گے کہ وہ

"مؤثر" نہیں۔ جتنا مقصد حاصل ہو، جتنی مقصد کی طرف پیش رفت ہو، اور جتنی تیزی کے ساتھ ہو، اتنی ہی تنظیم مؤثر ہو گی۔ یہ بالکل ممکن ہے کہ تنظیم اپنی جگہ پر قائم ہو لیکن وہ مؤثر نہ ہو۔

تنظیم کی دو قسمیں ہوتی ہیں۔ ایک تنظیم وہ ہے جو کسی کام کو قائم اور برقرار رکھے۔ انگریزی میں آپ یوں کہہ سکتے ہیں کہ جو maintenance کا کام کر سکے۔ دوسری تنظیم وہ ہے، جس کو میں تحریکی تنظیم کہوں گا، جو حرکت میں لاتی ہے، آگے بڑھاتی ہے اور نشوونما و ارتقا کا کام کرتی ہے۔ جس طرح بجٹ کے دو حصے ہوتے ہیں، ایک ریونیو بجٹ جو قائم رکھنے (maintenance) کا کام کرتا ہے، جب کہ دوسرا ڈویلپمنٹ بجٹ ہوتا ہے جو آگے بڑھاتا ہے۔ اسی طرح تنظیمیں بھی دو قسم کی ہوتی ہیں، یعنی وجود کو برقرار رکھنے والی تنظیم (maintenance organisation) اور کام کو آگے بڑھانے والی تنظیم (development organisation)۔

بعض تنظیمیں صرف ایک قسم کا کام کرتی ہیں، مثلاً یونی ورسٹی یا اسکول۔ یہ بھی ایک تنظیم ہے۔ آپ جو مساجد اور ادارے بناتے ہیں وہ بھی تنظیمیں ہیں جن کا کام یہ ہے کہ سال بھر نظام چلتا رہے اور یہ چیزیں قائم و برقرار رہیں۔ انھیں maintenance تنظیمیں کہا جا سکتا ہے۔

ایک تحریکی تنظیم کا کام محض وجود کو قائم رکھنا نہیں ہوتا بلکہ آگے بڑھ کر، حرکت میں آکر، کہیں پہنچنا اور مقصد کا حصول ہوتا ہے۔ لہٰذا یہ ناگزیر ہے کہ تحریک اور تنظیم کے اندر نشوونما، ترقی اور ارتقا کا عمل مسلسل جاری رہے۔ یہ بھی ضروری ہے کہ تحریکی تنظیم میں وجود کو قائم رکھنے کا کام بھی ہو تاکہ جو قدم آگے بڑھائے جائیں وہ اپنی جگہ پر قائم رہیں۔ البتہ اپنے وجود کو برقرار رکھنے کا کام جزوی ہوتا ہے۔ آگے بڑھنے کا کام ہی اس تحریک اور تنظیم کا اصل مقصد ہوتا ہے۔ اگر وہ صرف اپنے وجود کو برقرار رکھنے کا یا بھرم قائم رکھنے کا ہی کام کرتی رہے کہ جو علاقہ فتح کر لیا بس اسی کو برقرار رکھنا ہے، تو پھر وہ ایک تحریک نہیں رہتی بلکہ ایک ایسی تنظیم بن جاتی ہے جس کو صرف اپنے مقام یا وجود کو قائم و برقرار رکھنا ہو، یعنی maintenance تنظیم۔

اب آپ پر واضح ہو گیا ہو گا کہ "مؤثر تنظیم" کسے کہتے ہیں؟ اور اس سے میرے پیش نظر کیا بات ہے۔

سوال یہ ہے کہ تنظیم کو مؤثر کیسے بنایا جائے؟ کوئی بھی تنظیم ہو، یا جو تنظیم ہمارے پاس موجود ہے یعنی تحریک اسلامی، اس کو ہم کس طرح سے ان معنوں میں جو میں نے آپ کے سامنے پیش کیے ہیں، مؤثر (effective) بنا سکتے ہیں؟

کسی تنظیم کو مؤثر بنانے کے لیے بہت سے پہلو اور اصول ہیں جنھیں بیان کیا جا سکتا ہے۔ بہت سی تجاویز ہیں جو پیش کی جا سکتی ہیں لیکن میں نے صرف بنیادی اصولوں کا انتخاب کیا ہے۔ اس کے یہ معنی بھی

نہیں ہیں کہ صرف یہی اصول ہیں یا ان کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔ البتہ یہ ایسے بنیادی اصول ہیں کہ جنھیں پہلے قدم کے طور پر اپنایا جا سکتا ہے۔

تنظیم' حصول مقصد کا ذریعہ

پہلی چیز یہ ہے کہ تنظیم کو اصل مقصد کبھی نہ بننے دیا جائے۔ یعنی محض اس کے وجود کو برقرار رکھنے کے لیے کوشش نہ کی جائے بلکہ تنظیم کو مقصد کے حصول کا ذریعہ ہونا چاہیے۔ دنیا بھر میں تمام تنظیموں کو اس صورت حال کا سامنا کرنا پڑتا ہے کہ جب وہ پھیلنا شروع ہوتی ہیں تو بالآخر وہ خود ہی اپنی جگہ پر "مقصد" بننا شروع ہو جاتی ہیں۔ جو تنظیم کسی مقصد کے لیے بنتی ہے وہ خود خدمت کی طلب گار بن جاتی ہے۔ وہ وقت' وہ صلاحیت' وہ پیسہ جو مقصد کو آگے بڑھانے کے لیے لگنا چاہیے' اس کا بیشتر حصہ تنظیم کو برقرار رکھنے کے لیے لگنے لگتا ہے۔ یہ بات اپنی جگہ صحیح ہے کہ تنظیم کے وجود کو برقرار رکھنے کے لیے ناگزیر تقاضوں پر تنظیمی وسائل ضرور لگنے چاہییں لیکن یہی اصل چیز نہیں ہے۔ اور جیسے جیسے یہ تناسب بڑھتا جاتا ہے ویسے ویسے مقصدی تحریکی تنظیم کی تاثیر میں کمی آتی جاتی ہے۔ اگر دو آدمی ہوں گے اور وہ مل کر کام میں لگے رہیں گے تو بڑی عمدہ تنظیم ہو گی۔ جب تنظیم میں وسعت پیدا ہو جائے' لاکھوں افراد تک پھیل جائے اور وہ دعوت کے اصل ہدف مثلاً توسیع دعوت کو چھوڑ کر صرف اسی کام میں لگے رہیں کہ انھیں تنظیم کو برقرار رکھنا ہے تو بالآخر اس کی تاثیر کے اثر و نفوذ میں کمی آنا شروع ہو جائے گی۔

اس کے معنی دراصل یہ ہیں کہ تنظیم کے کارکنوں کو بار بار اپنے آپ کو یہ یاد دلانا چاہیے اور اس چیز کا جائزہ لینا چاہیے کہ جو تنظیمی وسائل ہیں--- اور وسائل سے میرا مطلب صرف مال نہیں ہے بلکہ آپ کے اوقات' آپ کی توجہ' آپ کی صلاحیتیں' تنظیم کے پاس جو افراد کار ہیں' یہ سب وسائل ہیں--- ان وسائل کا کتنا تناسب صرف تنظیم کے وجود کو برقرار رکھنے (maintenance) میں لگ رہا ہے اور کتنا تناسب تنظیم کو آگے بڑھانے اور مقصد کی طرف پیش رفت کرنے میں لگ رہا ہے؟ یہ وہ اہم ترین بات ہے جو کسی بھی تنظیم کے ہر سطح کے قائد یا رہنما کو برابر سوچتے رہنا چاہیے خواہ وہ کسی گاؤں یا چک سے تعلق رکھتا ہو یا پورے ضلع اور صوبے یا ملک گیر یا عالمی سطح پر رہنمائی کا فریضہ انجام دے رہا ہو۔

کہا جاتا ہے کہ موجودہ دور میں "قیادت" نام ہی سوچنے کا ہے۔ اب تو فوجیں بھی جرنیل لڑواتے ہیں۔ وہ پیچھے بیٹھ کر سوچتے رہتے ہیں کہ فوجیں کیسے لڑیں گی اور کیا حکمت عملی اپنائی جائے۔ وہ بندوق ہاتھ میں لے کر نہیں نکلتے۔ موجودہ دور میں جس پیمانے پر تنظیموں کو کام کرنے کی ضرورت ہے' خواہ تجارت میں جہاں بڑی بڑی کارپوریشن بنتی ہیں' یا فوج میں جہاں بڑی بڑی فوجیں جنگ عظیم لڑتی ہیں' یا تحریکوں میں جہاں بڑے بڑے انقلاب لانے ہوتے ہیں' قیادت کا اصل کام سوچ و بچار اور غور و فکر ہی ہے۔ فکر و تدبر کا یہ عمل برابر جاری رہنا چاہیے۔

تنظیمی وسائل کے صحیح استعمال کا یہ اصول اس لیے اہم ہے کہ غیر محسوس طور پر وسائل کے استعمال کا تناسب بگڑنے کا حادثہ پیش آ سکتا ہے۔ اس کے لیے ہر وقت ہوشیار' اور باخبر رہنا بہت ضروری ہے۔

آپ راستے پر جا رہے ہوں' اگر آپ چوکنے رہیں کہ کوئی حادثہ پیش نہ آ جائے تو آپ حادثے سے بچ سکتے ہیں لیکن اگر آپ کو احساس نہ ہو' چوکنے نہ ہوں تو آپ کسی بھی حادثے کا شکار ہو سکتے ہیں۔

بہت عام سی مثال سے اس بات کو سمجھا جا سکتا ہے۔ گاڑی کا مقصد سفر کر کے کہیں پہنچنا ہے۔ ڈرائیور کے بغیر گاڑی نہیں چل سکتی۔ گاڑی کے بغیر آپ آگے نہیں بڑھ سکتے۔ گاڑی کے اندر مسافروں کا بیٹھنا بھی ضروری ہے۔ گاڑی کے لیے پٹرول بھی درکار ہے' اس لیے کہ اس کے بغیر گاڑی آگے نہیں بڑھ سکتی۔ ان میں سے ہر چیز ضروری ہے۔ لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ گاڑی اپنے مقام پر کھڑی ہو' اس کے اندر مسافر بھی بیٹھے ہوں' ڈرائیور کا ہاتھ سٹیرنگ پر ہو' ایکسلیٹر دبا ہوا ہو' انجن کے چلنے کی آواز بھی آ رہی ہو' پٹرول اندر جا رہا ہو لیکن گاڑی وہیں کھڑی ہو۔ اس صورت میں ہم کہیں گے کہ گاڑی بہ ظاہر تو ہر لحاظ سے مکمل ہے اور ہر لحاظ سے حالات بالکل ٹھیک ہیں' اس لیے کہ انجن چل رہا ہے' پٹرول صرف ہو رہا ہے' مسافر موجود ہیں' ڈرائیور کے ہاتھ سٹیرنگ پر موجود ہیں۔ لیکن جب تک وہ گاڑی آگے نہیں بڑھے گی' وہ اپنی منزل تک نہیں پہنچ سکتی۔ یہی وہ چیز ہے جس پر بار بار سوچنے کی ضرورت ہے۔ بالکل اسی طرح کسی تنظیم کے پاس خواہ کتنے ہی کارکن اور وسائل ہوں' سب متحرک ہوں اور وسائل کھپ رہے ہوں لیکن اگر وہ آگے بڑھ کر اپنا مطلوبہ ہدف حاصل نہیں کر پاتے تو وہ تنظیم ایک تحریکی تنظیم نہیں ہے بلکہ اپنے وجود کو برقرار رکھنے والی تنظیم (maintenance organisation) ہے۔

میں تنظیم کی ضروریات اور تقاضوں کی نفی نہیں کر رہا بلکہ تنظیمی وسائل کے استعمال کے تناسب اور ترجیحات کی اہمیت کو اجاگر کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔

یہ پہلی بات ہے جو "مؤثر تنظیم" کے حوالے سے بنیادی اصول کی حیثیت رکھتی ہے۔

مطلوبہ کام کا صحیح اندازہ

پھر اس بات کا بھی جائزہ لیا جانا چاہیے کہ آخر ہمارا کام یا "جاب" کیا ہے؟ اگر میں کاروباری اور دفتری اصطلاح استعمال کروں تو اسے انگریزی میں size up کرنا کہیں گے' یعنی اپنے کام کا اندازہ کرنا۔ آپ کسی بھی سطح کی رہنمائی کا فریضہ انجام دے رہے ہوں مثلاً گاؤں' شہر یا صوبہ وغیرہ' آپ کو اپنے کام کا اندازہ کرنا یعنی اپنی جاب کو size up کرنا ہو گا۔ اس کے بغیر صحیح معنوں میں تنظیم کو مؤثر نہیں بنایا جا سکتا۔ یعنی اس بات کا اندازہ لگانا کہ کسی گاؤں میں کتنے لوگ ہیں؟ کتنے مرد اور کتنی عورتیں ہیں؟ کون لوگ بااثر ہیں؟ کہاں کہاں طاقت کے سرچشمے ہیں اور ان کو بالآخر ہمیں کیسے مسخر کرنا ہے؟ اگر آپ کو یہی نہیں معلوم کہ آپ کے علاقے یا بستی میں کتنے گاؤں ہیں اور کتنے افراد ہیں؟ کہاں کون سا چودھری بیٹھا ہوا ہے؟ کس کے

ہاتھ میں طاقت اور قوت ہے؟ کس مسجد کا امام و خطیب بااثر ہے اور کون بے اثر؟ تو آپ اس علاقے کو کیسے مسخر کر سکیں گے؟

اگر آپ کو کسی علاقے میں تحریک اسلامی کے کام کو صحیح معنوں میں آگے بڑھانا اور مؤثر انداز میں کرنا ہے تو سب سے پہلے آپ کو اپنی جاب' یعنی اپنے کام کا اندازہ ہونا چاہیے۔ اس کے بغیر آپ کوئی بھی ٹھوس منصوبہ نہیں بنا سکتے اور کسی طرح بھی تنظیم کو مؤثر نہیں بنا سکتے۔ اس صورت میں بہ ظاہر تنظیم متحرک ہو گی' وسائل صرف ہو رہے ہوں گے' توسیع دعوت کا کام یعنی افراد سے رابطہ اور ملاقاتیں کرنا' متفق اور کارکن اور ارکان بنانے کا کام بھی ہو رہا ہو گا لیکن اس علاقے میں تحریک کا وہ اثر و نفوذ قائم نہ ہو سکے گا جس کے نتیجے میں اس علاقے کو مسخر کیا جا سکے۔

درحقیقت ملاقاتیں کرنا' متفق یا ارکان بنانا ہی مقصود نہیں ہے بلکہ اصل مقصد تو یہ ہے کہ اس پورے علاقے اور آبادی کو اپنے مقصد کے لیے مسخر کرنا ہے۔ جو بھی متفق بنے' یا کارکن بنے' آپ کو ہمیشہ اسی مقصد کے پیش نظر اسے اسی معیار پر پرکھنا چاہیے اور یہ دیکھنا چاہیے کہ اس کے نتیجے میں آپ نے کیا کچھ حاصل کیا ہے۔ جہاں پر ہیں اور جہاں پر پہنچنا ہے' ان دونوں کا موازنہ کرنا چاہیے۔ جب تک آپ موازنہ نہیں کریں گے. آپ کی تنظیم مؤثر نہیں ہو گی اور تنظیم کو مؤثر بنانے کے لیے صحیح جذبہ بیدار نہ ہو سکے گا۔ اگر آپ کو یہی نہیں معلوم کہ مجھے کتنا کام بالآخر کرنا ہے؟ یا مطلوب ہدف و مقصد کیا ہے؟ تو اس کے معنی یہ ہیں کہ آپ ہر سال ایک رپورٹ بھرتے رہیں گے کہ اتنا کام ہوا ہے' لیکن آپ کو جس ہدف تک پہنچنا ہے' یعنی علاقے کو مسخر کرنا اور عوام الناس کے لیے مرجع خلائق (قائد) بننا' اس تک آپ نہیں پہنچ سکیں گے۔

موثر منصوبہ بندی

اپنے کام کا اندازہ کر لینے (size up) کے بعد پھر یہ طے کرنا چاہیے کہ کہاں پہنچنا ہے؟ کیسے پہنچنا ہے؟ پہنچنے کے لیے کن وسائل کی ضرورت ہے؟ اور وسائل کیسے فراہم ہوں گے؟ یہ چار سوال--- کہاں پہنچنا ہے؟ کیسے پہنچنا ہے؟ کیا وسائل درکار ہیں؟ اور وسائل کی فراہمی کیسے ہو گی؟--- بڑے اہم سوال ہیں۔ چھوٹے سے چھوٹا کام ہو یا بڑے سے بڑا کام' مثلاً کوئی پوسٹر نکالنا یا لگانا ہو' کوئی تربیت گاہ منعقد کرنا ہو' کوئی جلسہ کرنا ہو یا انتخاب لڑنا ہو یا پورے ضلع اور ملک میں انقلاب برپا کرنا ہو--- آپ کو ان کا جواب دینا ہو گا کہ ہمیں کہاں پہنچنا ہے؟ ہم وہاں کس طرح پہنچیں گے؟ پہنچنے کے لیے ہمیں کس چیز کی ضرورت ہو گی؟ وسائل اور ذرائع انسانی' مالی' سیاسی' معاشی' روحانی اور اخلاقی کیسے فراہم ہوں گے اور کہاں سے آئیں گے؟ مؤثر تنظیم کے لیے یہ تیسرا اصول ہے۔

ایسا بھی ہو سکتا ہے آپ نے چلنا شروع کیا اور پٹرول ختم ہو گیا' تو آپ کھڑے کے کھڑے رہ جائیں۔

آپ کو جتنے مسافروں کی ضرورت ہو وہ موجود ہی نہ ہوں اور آپ آگے نہ بڑھ سکیں۔ اسی نوعیت کے بہت سارے حادثات پیش آسکتے ہیں۔ صبح ہی صبح آپ بغیر سوچے سمجھے گھر سے نکل پڑتے ہیں' بنک پہنچتے ہیں' پتا چلا کہ چیک بک تو گھر ہی بھول آئے ہیں۔ اس لیے کہ آپ نے نکلنے سے پہلے پانچ منٹ بیٹھ کر یہ نہیں سوچا تھا کہ مجھے آج کیا کام کرنا ہے اور کس چیز کی ضرورت پڑے گی؟ اب آپ جیب میں تلاش کرتے ہیں یا سوچتے ہیں کہ ارے یہ تو میں گھر ہی چھوڑ آیا-- اسی طرح کہیں ایسا نہ ہو کہ ایک مدت گزرنے کے بعد آپ یہ سوچیں کہ اوہ' یہ چیز تو ہم پہلے ہی بھول گئے تھے اور ہم وہیں کھڑے ہیں جہاں سے ہم نے سفر شروع کیا تھا۔

لہٰذا سوچنے کا عمل اور برابر سوچنے کا عمل' بہت ضروری ہے۔ اسے منصوبہ بندی یا پلاننگ کے نام سے بھی لوگ پکارتے ہیں۔ منصوبہ بندی کے حوالے سے بہت سے اصول و ضوابط بیان کیے جاسکتے ہیں لیکن بنیادی طور پر یہ سوالات ہی منصوبہ بندی کے لیے بنیاد کی حیثیت رکھتے ہیں۔

خواہ معاملہ چھوٹے سے گاؤں کا ہو یا شہر اور ملک کا' بہرحال آپ کو یہ دیکھنا پڑے گا کہ آپ اس وقت کہاں کھڑے ہیں؟ آگے بڑھنے کا عمل ایک تدریجی عمل ہے۔ ایک جست لگا کر ہم اپنی منزل تک نہیں پہنچ سکتے۔ ہمیں ایک قدم کے بعد دوسرا قدم آگے بڑھانا ہو گا۔ فوج بھی اگر مارچ کرتے ہوئے لیفٹ رائٹ کرتی ہوئی برابر قدم بڑھائے تو آگے بڑھ جاتی ہے۔ اگر آپ چاہیں کہ آپ ایک ہی چھلانگ لگا کر منزل پر پہنچ جائیں تو یہ نہیں ہو گا۔ پھر آپ کو یہ بھی سوچنا چاہیے کہ ایک ماہ' ایک سال یا پانچ سال کے بعد یہ ایک قدم یا اقدام آپ کو کہاں لے جائے گا؟ اگر آپ اتنی بصیرت نہیں رکھتے کہ اس بات کا اندازہ لگا سکیں کہ پانچ سال کے بعد کسی چک' گاؤں' تحصیل یا ضلع میں تحریک کا کام کہاں تک پہنچے گا یا اسے کہاں تک پہنچنا چاہیے تو پھر اس کا نتیجہ یہی ہو گا کہ آپ وہیں کھڑے رہیں گے جہاں پر آپ آج کھڑے ہیں۔

طویل المعیاد منصوبہ بندی کے ساتھ ساتھ آپ کو قلیل المعیاد منصوبہ بندی کے طور پر چھوٹے چھوٹے قدم بھی اٹھانے ہوں گے کہ اگلے چند ماہ یا ایک سال میں ہم اتنا آگے بڑھیں گے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ آپ میں اتنی بصیرت ہو کہ آپ جان سکیں کہ اگلے پانچ یا ۱۰ سال میں ہمیں اپنے کام کو کہاں تک پہنچانا ہے۔ اس کے لیے سوچنے' جائزہ لینے اور کام کو بہتر بنانے کی ضرورت ہے۔ یہی وہ چیز ہے جو جائزے کے لیے ضروری ہے۔ اگر رپورٹ کے اندر اس بات کا ذکر ہی نہ ہو کہ کیا کرنا تھا اور کیا کیا؟ تو یقیناً ایسی رپورٹ یا جائزہ "تحریکی تنظیم" کے لیے تو بے مقصد ہو گا البتہ maintenance تنظیم کے لیے کافی ہے کہ سڑک کی مرمت کروائی گئی یا مدرسے یا مسجد کے انتظامات بہتر کیے گئے وغیرہ۔ ایسی تنظیم جو "تحریکی تنظیم" ہے' اس کے لیے یہ ناگزیر ہے کہ وہ دیکھے کہ اسے کہاں پہنچنا تھا' کتنا آگے بڑھے ہیں اور مزید آگے کیسے بڑھنا ہے؟ جب تک کسی رپورٹ میں اس بات کا جائزہ نہ لیا جائے' وہ "تحریکی تنظیم" کے لیے بے مقصد

ہے۔ اس سے کچھ حاصل نہ ہو گا۔ نتیجتاً رپورٹ یا جائزہ لینے کا عمل ایک رسم بن کر رہ جاتا ہے اور عملاً کام جمود کا شکار ہو جاتا ہے۔

نتائج پر نظر رکھنا

چوتھا اصول یہ ہے کہ آپ ایک سوال کرنے کی عادت ڈالیں اور وہ سوال ہے: "کیوں؟"۔ آپ کہیں گے یہ تو بڑا آسان سوال ہے۔ لیکن عملاً یہ بہت مشکل سوال ہے۔ اس لیے کہ "یہ کام ہم کیوں کر رہے ہیں؟ اور اس سے کیا حاصل ہو رہا ہے؟" اس سوال کے نتیجے میں جو جواب آتا ہے وہ اکثر بڑا ناگوار اور تکلیف دہ ہوتا ہے۔ یہ ضروری ہے کہ کوئی بھی کام شروع کرنے سے پہلے آپ یہ دیکھیں کہ یہ کام ہم کیوں کرنا چاہتے ہیں؟ کام کرتے ہوئے بار بار اپنے آپ سے پوچھیے کہ یہ کام ہم کیوں کر رہے ہیں؟ اگر کر چکے ہیں تو پوچھیے کہ اس کو ہم کیوں کر رہے تھے؟ اگر آپ بہت سے کاموں کو ان سوالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے جانچ کر دیکھیں کہ وہ مقصد کو آگے نہیں بڑھا رہے تو پھر اس کے معنی یہ ہوں گے یا تو آپ ان کو بہتر بنائیں یا پھر ان کو ترک کر دیں۔ اس لیے کہ غیر مفید (un - productive) کام کرنا ایسے ہی ہے جیسے کسی کارخانے میں کوئی مال ایسا بن رہا ہو جو بکتا ہی نہ ہو' یا کوئی مزدور ایسا ملازم ہو جو کام نہ کرتا ہو۔ پھر اس "کیوں؟" کے نتیجے میں یہ بات سامنے آئے گی کہ یہ مال کیوں بنایا جا رہا ہے؟ کیا اسے صرف سٹور کرنے کے لیے بنایا جا رہا ہے؟ یا اگر اسے فروخت کرنا ہے تو پھر اس کے لیے خریدار پیدا کرنے ہوں گے ورنہ اس مال کو بنانے کا کیا فائدہ؟ گویا یا تو ہم اس کام کو کسی مقصد کے لیے مفید بنائیں یا پھر اسے ترک کر دیں۔

اس فیصلے پر عمل درآمد کرنا بڑا مشکل کام ہوتا ہے۔ اس لیے کہ جب کسی کام کو ترک کرنے کا فیصلہ کیا جاتا ہے تو فوراً یہ دلیل سامنے آتی ہے: "یہ کام کیوں ترک کیا جائے؟ یہ تو ہمیشہ ہی سے ہوتا چلا آ رہا ہے۔ اس لیے اسے ہونا چاہیے"۔ بعض کاموں کے لیے تو یہ دلیل بڑی ضروری اور مضبوط ہے' جیسے روایات' بالخصوص بنیادی روایات۔ یہ تو ہر صورت میں برقرار رہنی چاہییں۔ مثلاً نماز کیوں پڑھی جاتی ہے؟ اگرچہ اس کے مقصد اقم الصلٰوۃ لذکری کا بار بار ذکر آیا ہے' لیکن اگر ذکر اور خشوع و خضوع کی کیفیت نہ بھی ہو' نماز تو بہرحال پڑھی جائے گی' اس لیے کہ وہ فرض کر دی گئی ہے۔ البتہ ہر وہ کام جو ہم نے خود سے اپنے اوپر لازم کر لیا ہے اس کا کرنا صرف اس لیے ضروری نہیں کہ ہم اس کو کرتے چلے آ رہے ہیں۔ اصل چیز کام کا نتیجہ خیز ہونا ہے۔ اس مقصد کے لیے اگر کوئی کام جو ہم پہلے سے طے کر چکے ہیں مؤثر ہے' مقصد کو آگے بڑھا رہا ہے' تو وہ ضرور ہونا چاہیے۔ اگر مقصد کو آگے نہیں بڑھا رہا تو اتنی ہمت و جرأت ہونی چاہیے کہ ہم اس کو ترک کر دیں۔

مثال کے طور پر سالانہ تربیت گاہ محض اس لیے منعقد کرنا کہ منصوبہ عمل میں شامل ہے تو یہ انداز maintenance تنظیموں کا سا ہے' تحریکی تنظیموں کا نہیں۔ اصل بات تو سوچنے کی یہ ہے کہ تربیت گاہ

کس مقصد کے لیے منعقد کی جا رہی ہے؟ کارکنان کو ان تین دنوں میں کیا دے کر واپس بھیجنا ہے؟ وہ کیا چیز لے کر جائیں کہ اگلے پورے سال کے کام میں یہ مفید ہو؟ اگر اس انداز میں سوچا جائے تو شاید تربیت گاہ زیادہ مفید ثابت ہو۔

اسی طرح رپورٹ فارم ہو یا اجتماع' جلسہ عام ہو یا کوئی بھی کام' آپ بار بار سوچیں کہ یہ کیوں ہو رہا ہے؟ کیا اس سے مقصد آگے بڑھ رہا ہے؟ کیا ہمارے قدم آگے بڑھ رہے ہیں؟ کیا ہم اپنی منزل کے قریب آ رہے ہیں؟ اگر نہیں آ رہے تو ذرا رک کر اس فیصلے پر نظرثانی کرنا چاہیے اور وقت' وسائل اور صلاحیتوں کو کسی ایسے بہتر کام میں لگانا چاہیے جس کے نتیجے میں ہماری منزل قریب آ سکے اور ہم مطلوبہ ہدف حاصل کر سکیں۔ اگر آپ نے اس طرز عمل کو اپنایا تو بہت سے غیر مفید کام ترک کیے جا سکیں گے اور ہلکے پھلکے ہو کر آپ تیزی کے ساتھ شاید زیادہ آگے بڑھ سکیں۔

تنظیم کا بوجھل پن

پانچویں چیز جس کی طرف میں اشارہ کر رہا ہوں وہ یہ ہے کہ بھاری اور بوجھل چیز کے مقابلے میں ہلکی پھلکی چیز کم وسائل کے ساتھ زیادہ تیزی سے آگے بڑھ سکتی ہے۔ جس فوج کے پاس جتنا ہلکا' تیز اور swift اسلحہ ہو گا' اتنی ہی تیزی کے ساتھ وہ آگے بڑھ سکے گی۔ دنیا میں ابتدا ہی سے ان فوجوں نے کامیابی حاصل کی ہے جن کے پاس ہلکا پھلکا اور تیز رفتار اسلحہ تھا۔ گھوڑے آئے تو آگے بڑھ گئے' ٹینک آئے تو آگے بڑھ گئے اور ایٹم بم چلے گا تو قوم کی قوم کو تباہ کر دے گا کیونکہ ہلکی پھلکی چیز تیزی کے ساتھ آگے بڑھ سکتی ہے اور کام کر سکتی ہے۔ جتنا آدمی موٹا ہوتا جائے اتنا ہی اس کا آگے بڑھنا مشکل ہو جاتا ہے۔

اسی طرح تنظیمیں وسعت کے بعد بھاری' بوجھل اور موٹاپے کا شکار ہو جاتی ہیں جس سے کارکردگی متاثر ہوتی ہے۔ اس ضمن میں دو چیزیں خاص طور پر قابل غور ہیں۔ میں یہ بات صرف تحریک اسلامی کو سامنے رکھ کر نہیں بیان کر رہا بلکہ دنیا بھر کی تنظیموں کے مسائل کو پیش نظر رکھ کر بیان کر رہا ہوں۔

کمیٹیوں کا قیام: پہلی چیز کمیٹی کا قیام ہے۔ کمیٹیاں اس لیے بنائی جاتی ہیں کہ لوگ بیٹھیں' مشورہ کریں۔ مگر دنیا بھر کا تجربہ ہے کہ کمیٹی بنانا' کام کرنے کا سب سے زیادہ غیر مؤثر طریقہ ہے۔ اس لیے ہر مسئلے کا حل کمیٹی بنا دینا نہیں۔ ہوتا یہ ہے کہ کمیٹیاں بڑھتی جاتی ہیں' رپورٹوں کی تعداد بڑھتی جاتی ہے لیکن مسائل حل نہیں ہوتے۔ مگر جو ناگزیر اور ضروری ہو وہ کمیٹی ضرور بنائی جانی چاہیے۔

اجتماعات کا انعقاد: دوسری اہم چیز اجتماعات یا میٹنگ کا انعقاد ہے۔ یورپ میں ایک کتاب میٹنگز' میٹنگز اور میٹنگز کے نام سے چھپی ہے۔ اس میں لکھا ہے کہ سب سے زیادہ وقت میٹنگ میں ہی لگتا ہے۔ یقیناً میٹنگ یا اجتماع کرنا بہت ضروری ہے کیونکہ جب تک لوگ مل کر بیٹھیں گے نہیں' تنظیم چل نہیں سکتی۔ میرا مقصد میٹنگ یا اجتماع کی اہمیت کو کم کرنا نہیں ہے' البتہ اس میں ایک تناسب ضروری ہے۔

میٹنگ وہی ہونی چاہیے جو ضروری اور ناگزیر ہو اور نتیجہ خیز ہو۔ اگر بہت سے اجتماعات کے بارے میں یہ سوچ لیا جائے کہ آخر اس سے ہمیں کیا حاصل ہو گا؟ تو شاید انھیں کم اور مختصر وقت میں کیا جا سکے۔ اگر تنظیم کے ذمہ داران اور کارکنوں کے اوقات کا بڑا حصہ اجتماعات کے انعقاد کی نذر ہو جائے تو وہ دعوتی امور اور اپنے حلقے میں رہنمائی کا کام مؤثر انداز میں کیسے کر سکیں گے؟ اور اسلامی انقلاب کی راہ کیسے ہموار کر سکیں گے؟ لوگوں سے ملاقات' ان کے مسائل میں دلچسپی اور دعوت کے کام کو زیادہ وقت نہ دیا جا سکے گا جو کہ کام کو آگے بڑھانے اور مطلوبہ ہدف کے حصول کے لیے ناگزیر ہے۔ لہٰذا زیادہ اجتماعات کا انعقاد تحریک کو بوجھل بناتا ہے۔ اس لیے ناگزیر اجتماعات کم سے کم وقت میں منعقد کرنے سے تحریک کے وسائل کو زیادہ بہتر انداز میں صرف کرنا ممکن ہو سکے گا۔

اجتماع یا میٹنگ کوئی بری چیز نہیں ہے۔ مفید اور ضروری چیز ہے لیکن بہرحال اس کو کم ہونا چاہیے۔

وقت' اہم ترین وسیلہ

چھٹی چیز' جو سب سے زیادہ قیمتی جنس' وسیلہ یا شے ہے' جسے سب سے زیادہ کارگر اور کارآمد ہونا چاہیے' وہ "وقت" ہے۔ آپ کا سب سے قیمتی وسیلہ' آپ کا وقت ہے۔ کام بغیر مال' بغیر مکان اور بغیر جگہ کے ہو سکتا ہے مگر کوئی بھی کام "وقت" کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ اس لیے کہ ہر کام وقت چاہتا ہے۔ آپ کو اجتماع کرنا ہو تو وقت چاہیے' دعوتی کام کرنا ہو تو وقت چاہیے' دفتر چلانا ہو تو وقت چاہیے اور اگر پوسٹر لگانا ہو تو وقت چاہیے۔ مال کے بغیر بہت سے کام ہو سکتے ہیں' جیسا کہ میں نے کہا' کام مال و دولت' جگہ اور دفاتر وغیرہ کے بغیر بھی ہو سکتے ہیں۔ مگر وقت ایک ایسی چیز ہے جس کے بغیر کوئی کام نہیں ہو سکتا۔ پھر وقت کے لیے بڑی اہم بات یہ ہے کہ اسے کہیں سے قرض لے کر بڑھایا نہیں جا سکتا۔ آپ چندہ لے کر فنڈز بڑھا سکتے ہیں' مکان بنا سکتے ہیں لیکن وقت کسی سے قرض نہیں لے سکتے۔ پیسہ محفوظ رکھا جا سکتا ہے لیکن وقت کو محفوظ رکھنا' سٹور یا ڈیپازٹ کر لینا ممکن نہیں۔ وقت کا معاملہ تو ایسا ہے کہ ادھر آپ نے پلک جھپکی ادھر ایک لمحہ گیا۔ بعض دفعہ پلک جھپکنے میں صدیاں گزر جاتی ہیں۔ اس لیے وقت کے استعمال میں ہوشیار' چوکنا اور محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ اس لیے کہ وقت ہماری سب سے قیمتی چیز ہے' فرد کے لیے بھی' جماعت کے لیے بھی اور قوم کے لیے بھی۔ اگر وقت کی قدر و قیمت کا صحیح احساس آپ نے خود بھی کیا اور اپنے ساتھیوں کو بھی کرایا تو پھر کم وقت میں زیادہ کام ہو گا اور تنظیم مؤثر ہو گی۔ اگر وقت صحیح طور پر استعمال نہ ہو تو پھر وقت کا ضیاع بھی ہو گا اور مطلوبہ اہداف بھی حاصل نہ ہو پائیں گے۔

وقت تو ضرور ضائع ہوتا ہے' اس سے کوئی بچ نہیں سکتا۔ میں چاہتا ہوں کہ اس سے پہلے کہ وہ وقت آئے جب آپ کہیں: رَبِّ ارْجِعُوْنِ ○ لَعَلِّیْٓ اَعْمَلُ صَالِحًا فِیْمَا تَرَکْتُ کَلَّاؕ (المومنون ۲۳: ۹۹-۱۰۰)۔ یعنی اب تو واپس وہی وقت مل جائے' اب میں ٹھیک کام کروں گا۔ اس وقت کے آنے سے پہلے عقل مندی

کا تقاضا یہ ہے کہ وقت کو خوب سوچ سمجھ کر بہترین طریقے پر استعمال کیا جائے تاکہ کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ کام ہو سکے اور اگر وقت ضائع بھی ہو تو کم سے کم ضائع ہو۔

وقت کو بہترین انداز میں کیسے استعمال کیا جائے؟ یا وقت کو ضائع ہونے سے کیسے بچایا جائے؟ اس ضمن میں' چند بنیادی اصول آپ کے سامنے پیش کروں گا۔

آپ ناظم ضلع' ناظم ڈویژن' ناظم حلقہ یا کسی بھی سطح کے ذمہ دار ہوں یا کارکن ہوں' سب سے پہلا کام جس طرح بیت المال کا آڈٹ کرتے ہیں کہ پیسے کہاں سے آئے اور کہاں خرچ ہوئے؟ اسی انداز میں اپنے وقت کا آڈٹ کیا جائے۔ یہ بات غور طلب ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہفتہ بھر میں ۱۶۸ گھنٹے آپ کو عطا کیے ہیں' جو آپ کے اکاؤنٹ میں آئے اور نکل گئے مگر آپ اس کا جائزہ ہی نہیں لیتے۔ بیت المال کا تو آپ آڈٹ کراتے ہیں' حساب لگاتے ہیں اور رپورٹ مانگتے ہیں مگر وقت کا حساب نہیں لگاتے جو کہ مال سے زیادہ قیمتی چیز ہے۔ درحقیقت اہم ترین چیز آپ کا وقت ہی ہے۔ لہٰذا اس بات کی ضرورت ہے کہ ہر فرد اپنے وقت کا جائزہ لے کہ کتنا وقت کہاں اور کیسے خرچ ہوا؟ مگر افسوس کہ وقت کا کوئی حساب نہیں رکھتا۔

وقت کا آڈٹ یا جائزہ کیسے لیا جا سکتا ہے؟ اس غرض کے لیے آپ اپنے وقت کا کوئی مخصوص دورانیہ مثلاً ایک ہفتہ' دو ہفتے یا ایک مہینے کا اپنا "آڈٹ اکاؤنٹ" بنایئے۔ ایک خانہ "آمدن" کا بنایئے جب کہ دوسرا خانہ "خرچ" کا۔ "آمدن" کے خانے میں آپ منٹ' گھنٹے اور دن درج کیجیے جب کہ "خرچ" کے خانے میں یہ تفصیل درج کیجیے کہ وقت کہاں کہاں خرچ ہوا؟ اس کے بعد آپ اس بات کا جائزہ لیجیے کہ کون سا کام تحریک و تنظیم کے لیے مفید اور اہم ہے اور کون سا کام غیر مفید اور غیر اہم۔ پھر آپ دیکھیں گے کہ یہ بات جو اکثر کہی جاتی ہے کہ "کام کے لیے وقت نہیں ملتا" اتنی صحیح نہیں ہے۔ وقت اتنا بھی "ناپید" نہیں ہے۔

اگر آپ اپنے اس وقت کا وہ تناسب نکالیں جو کسی کام میں نہیں لگتا' محض ضائع ہو جاتا ہے' تو آپ کو نظر آئے گا کہ کام کے لیے بہت وقت بچتا ہے۔ آخر سونے کے لیے وقت ہے' ہر کام کے لیے وقت ہے۔ میں تزکیہ و قربانی کی بات نہیں کر رہا۔ میں سیدھی سیدھی یہ بات کر رہا ہوں کہ اپنے وقت کا جائزہ لیجیے۔ اگر آپ کو یہ بات گراں نہ گزرے تو میں کہوں گا کہ "بنیے" کی طرح بیٹھ کر اپنے وقت کا حساب کیجیے۔

امام غزالیؒ نے فرمایا ہے کہ صبح شروع کرو تو اپنے نفس کے ساتھ تجارت کے انداز میں یہ بات کرو کہ میں نے ۲۴ گھنٹے تیرے حوالے کیے ہیں اور تو نے انھیں اس طرح استعمال کرنا ہے۔ یہ میرا اور تیرا معاہدہ ہے۔ کل میں تجھ سے حساب لوں گا کہ تو نے انھیں کس طرح استعمال کیا۔

یہ پورا عمل ہے محاسبے کا' تجارت کا اور شرائط کا۔ لیکن آپ کو تحریکی نقطۂ نظر سے سوچنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے جو وقت آپ کو دیا ہے' اسے آپ کیسے بہتر انداز میں استعمال کر سکتے ہیں۔ جس طرح آپ

بیت المال کا حساب کرتے ہوئے یہ اعتراض کرتے ہیں کہ ٹرانسپورٹ پر یا عمارات کی تعمیر پر زیادہ سرمایہ لگ رہا ہے' بالکل اسی طرح آپ وقت کا حساب بھی کیجیے۔ اس بات کا جائزہ بھی لیجیے کہ کہاں وقت زیادہ لگ رہا ہے اور کہاں کم؟ اور کہاں وقت ایسی چیزوں میں لگ رہا ہے جہاں نہیں لگنا چاہیے۔ اس کے بعد آپ جس طرح حساب کتاب کرتے ہوئے یا بجٹ بناتے ہوئے فضول اخراجات ختم کر دیتے ہیں' اسی طرح قلم لے کر اپنی فہرست سے ایسے کاموں کو کاٹ دیجیے کہ آیندہ کچھ مدت تک ہم یہ کام نہیں کریں گے۔ اس لیے کہ اس کام کے کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔

وقت کے صحیح استعمال کا تیسرا اصول (trick) یہ ہے کہ ایسے کام جو دو دو' چار چار منٹ لیتے ہیں' ان کو ترک کر دیجیے۔ اس لیے کہ اس طرح کام کرنے سے بہتر نتائج نہیں نکلتے۔ اس کے بجائے آپ اپنے کام مسلسل چند گھنٹے یا طویل دورانیے میں یکسو ہو کر کرنے کی کوشش کیجیے۔ اس طرح زیادہ کام' بہتر انداز میں کیا جا سکتا ہے۔

تحریک اسلامی کے ذمہ داران خواہ وہ کسی بھی سطح کے ناظم' قیم یا امیر ہوں' انھیں کچھ نہ کچھ وقت اپنی تحریک' تنظیم اور ساتھیوں کے بارے میں سوچنے کے لیے مخصوص کرنا چاہیے۔ اس مقصد کے لیے روزانہ' ہفتے میں یا مہینے میں کچھ وقت متعین کر کے وہ کوئی اور کام نہ کریں اور صرف یہ سوچیں کہ آیندہ چار یا چھ ماہ میں مجھے اس تحصیل' ڈویژن یا ضلع میں اس کام کو کیسے آگے بڑھانا ہے؟ اگر آپ اس چیز کی عادت ڈال لیں تو کام کی نئی راہیں کھلتی محسوس ہوں گی۔ اسی طرح اگر تنظیم کی طرف سے آپ کو کوئی ذمہ داری سونپی جاتی ہے یا کوئی کام آپ کے ذمے لگایا جاتا ہے تو اسے چھوٹے چھوٹے وقفوں میں کرنے کے بجائے اگر طویل وقفوں میں لگ کر اور یکسو ہو کر کریں گے تو آپ محسوس کریں گے کہ آپ کی کارکردگی بہتر ہو گئی ہے۔ اس کے نتیجے میں یقیناً تنظیم کی مجموعی کارکردگی (efficiency) میں بہتری ہو گی اور کام کی رفتار بڑھ جائے گی۔ (جاری)

(کیسٹ سے تدوین: امجد عباسی)

مرضی کا تابع دین

وَيَبْغُونَهَا عِوَجًا

اور چاہتے ہیں کہ یہ راستہ ٹیڑھا ہو جائے (ابراہیم ۱۴: ۳)

وہ اللہ کی مرضی کے تابع ہو کر نہیں رہنا چاہتے بلکہ یہ چاہتے ہیں کہ

اللہ کا دین

- ان کی مرضی کا تابع ہو کر رہے
- ان کے ہر خیال، ہر نظریے اور ہر وہم و گمان کو اپنے عقائد میں داخل کرے
- کسی ایسے عقیدے کو اپنے نظامِ فکر میں نہ رہنے دے جو ان کی کھوپڑی میں نہ سماتا ہو
- ان کی ہر رسم، ہر عادت اور ہر خصلت کو سندِ جواز دے
- کسی ایسے طریقے کی پیروی کا ان سے مطالبہ نہ کرے جو انھیں پسند نہ ہو
- وہ ان کا ہاتھ بندھا غلام ہو کہ جدھر جدھر یہ اپنے شیطانِ نفس کے اتباع میں مڑیں ادھر وہ بھی مڑ جائے
- وہ انھیں کہیں نہ ٹوکے اور نہ کسی مقام پر انھیں اپنے راستے کی طرف موڑنے کی کوشش کرے

وہ اللہ کی بات صرف اسی صورت میں مان سکتے ہیں جب کہ وہ اس طرح کا دین ان کے لیے بھیجے

(تفہیم القرآن ۲، ص ۴۷۰)

(خیر خواہ)

دعوت و تحریک

نظام اسلامی کی جدوجہد

مولانا عبدالمالک

ایک صاحب نے جماعت اسلامی کی جدوجہد پر کچھ سوالات اٹھائے‘ جن کا مولانا عبدالمالک نے تفصیل سے جواب دیا۔ اسے شائع کیا جا رہا ہے۔ سائل کا موقف جواب میں ہی آگیا ہے۔ (مدیر)

”تبدیلی اقتدار (جو کہ دراصل حصول اقتدار کا دوسرا نام ہے) بذات خود اسلامی نظام کے قیام اور مسائل کے حل کی ضمانت فراہم نہیں کرتا بلکہ اپنے آپ کو اور اپنی جماعت کو صالحین قرار دیتے ہوئے اقتدار کا اہل اور مستحق قرار دینا ہے۔ یہ ایسا عظیم فتنہ ہے جس کی بدترین مثال ہماری بدقسمت تاریخ میں جنگ جمل‘ جنگ صفین‘ واقعات کربلا وغیرہ کی صورت میں پہلے ہی سے موجود ہے۔ نہ معلوم کب تک ہماری نسلوں کو بزعم خود صالحیت اور اہلیت کے دعوے داروں کے ہاتھوں تبدیلی اقتدار (حصول اقتدار) کے لیے تختۂ مشق بننا پڑے گا“۔ یہ آپ کا پہلا نکتہ ہے۔ آپ کے اس نکتے کا حاصل یہ ہے کہ حصول اقتدار اور تبدیلی اقتدار کے لیے کوشش کرنا فتنہ ہے۔ اور جنگ جمل‘ جنگ صفین اور واقعہ کربلا میں صحابہ کرامؓ نے جو کوشش کی وہ فتنہ تھی۔ آپ کی خواہش ہے کہ یہ کوشش جو فتنہ کی حیثیت رکھتی ہے‘ ختم کی جائے۔ آپ کے نزدیک جو گروہ صالحیت کی بنا پر اپنی جماعت کو اقتدار کے لیے پیش کرتا ہے وہ قرآن و سنت کی روشنی میں نااہل‘ غیر صالح اور غیر مستحق قرار پاتا ہے۔

دوسرے نکتے میں آپ فرماتے ہیں کہ: ”اعلاے کلمۃ اللہ کے حوالے سے واحد لائحہ عمل بنیادی اسلامی نظریے کو تسلیم کروانا‘ اسے سپریم لا قرار دلوانا اور اس کے حصول کے لیے تمام دینی جماعتوں اور تحریکوں کو ایک پلیٹ فارم پر متحد کرنا بھی مطلوب ہونا چاہیے“۔ تیسرے نکتے میں آپ پہلے نکتے کے بالکل برعکس فرماتے ہیں کہ: ”جہاں تک تبدیلی اقتدار کا تعلق ہے یہ مطلوب ضرور ہے لیکن مقصود ہرگز نہیں“۔ پھر آپ فرماتے ہیں کہ: ”قرآن میں امارت کے قیام کے حوالے سے منکم کی شرط موجود ہے۔ یعنی امارت پر صرف ایسے اہل مسلم افراد مامور کیے جائیں جو مسلمانوں کی طرف سے (منکم) منتخب کیے جائیں“۔ اس کے لیے آپ جماعت کی طرف سے دفعہ ۶۲‘ ۶۳ کے مطابق انتخاب کے مطالبے کی تائید کرتے ہیں۔ لیکن بائیکاٹ کو غلط قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ: ”اس کے نتیجے میں اکثریت نے انتخاب کا بائیکاٹ کر دیا اور نواز

شریف بھاری مینڈیٹ کے دعووں کے ساتھ برسر اقتدار آگیا"۔ آپ کے نزدیک دفعہ ۶۲' ۶۳ شریعت کے مطابق انتخاب کی ضمانت نہیں دیتی بلکہ اس کے لیے انتخابی قوانین میں تبدیلی لانا ہو گی۔ اس تیسرے نکتے میں آپ نے دونوں نکتوں کے برعکس تبدیلی اقتدار کی ضرورت کو تسلیم کیا اور اسے قرآن کی ہدایت قرار دیا۔ قرآن کے مطابق اقتدار اہل لوگوں کو ملنا چاہیے اور اس کے لیے انتخابی قوانین میں تبدیلی لانی چاہیے' یہ آپ کے اس نکتے کا حاصل ہے۔ اگر آپ اس تیسرے نکتے کو تسلیم کرتے ہیں تو پھر آپ جماعت اسلامی کو اس بات کی تلقین کیوں کرتے ہیں کہ وہ صرف نظریاتی کام کرے' اور تبدیلی اقتدار کے لیے کوشش کو فتنہ کیوں قرار دیتے ہیں' یہ تضاد سمجھ سے بالاتر ہے۔

آپ ایک مرتبہ اپنے خط کو پڑھیں اور پھر آپ غور کریں کہ آپ کیا چاہتے ہیں؟ کیا آپ یہ چاہتے ہیں کہ جماعت اسلامی صرف نظریاتی کام کرے' عملی سیاست میں حصہ نہ لے' انتخابی میدان دوسروں کے لیے خالی چھوڑ دے تاکہ حصول اقتدار کے لیے غلط کار لوگ' انگریز کے ایجنٹ' لادین یا لبرل لوگ ہی کوشش کرتے رہیں اور وہی کرسی اقتدار پر براجمان ہوں۔ اگر آپ یہ چاہتے ہیں تو پھر آپ کے تیسرے نکتے پر کیسے عمل ہو گا؟ اہل لوگ میدان میں کہاں سے آئیں گے؟ انھیں میدان میں آنا چاہیے یا نہیں' وہ انتخابی میدان میں کودیں یا باہر رہ کر تماش بین اور واعظ کا کردار ادا کریں؟--- آپ جس انداز سے سوچ رہے ہیں یہ سوچ واضح نہیں ہے۔ بہت سے لوگ آپ کی طرح گومگو کی پوزیشن میں ہیں جو دراصل فکری انتشار ہے۔ اس فکری انتشار کا حل یہ ہے کہ ہم اپنے اپنے اجتہادات کو ایک طرف رکھ کر کتاب و سنت کی روشنی میں جماعت اسلامی کے نظریے کو سمجھنے کی کوشش کریں اور پھر اپنے خیالات و نظریات اور تجاویز و آرا اس کی روشنی میں ترتیب دیں۔ اس سلسلے میں آپ درج ذیل امور کو ملحوظ رکھیں تو امید ہے کہ آپ کو جماعت اسلامی کے موقف کے بارے میں اطمینان حاصل ہو گا۔

کائنات کا حکمران اللہ تعالیٰ ہے۔ وہی کائنات کا نظام چلا رہا ہے۔ اسی نے انسان کو پیدا کیا ہے۔ وہی انسان کو اس کی تمام ضروریات فراہم کرتا ہے۔ اس لیے وہی اس بات کا حق دار ہے کہ انسان اس کی عبادت کرے' اس کے احکام کو مانے' اس کی حکومت قائم کرے (پاکستان کے دستور میں بھی اس نظریہ کو تسلیم کیا گیا ہے)۔ انبیا علیہم السلام کے ذریعے اللہ نے اپنا نظام حکمرانی نازل فرمایا اور انھیں حکمران بنا کر بھیجا ہے۔ انبیا علیہم السلام اللہ کی طرف سے نامزد حکمران ہوا کرتے ہیں۔ وہ اللہ کے نظام اور اپنی اطاعت کی طرف دعوت دیتے ہیں۔ انبیا علیہم السلام کو اللہ تعالیٰ نے حکومت کے لیے نامزد کیا ہوتا ہے۔ ان کے ذریعے اللہ تعالیٰ اپنی حکومت قائم کرتا ہے۔ مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ ج (النساء ۴:۸۰) جس نے رسولؐ کی اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی---- لیکن وہ انھیں غیب سے اور اپنی قدرت سے حکومت لے کر نہیں دے دیتا۔ حکومت حاصل کرنے کے لیے انھیں دعوت اور جہاد سے کام لینا ہوتا ہے۔ انبیا

علیہم السلام اپنی حکومت کی طرف دعوت بھی دیتے ہیں، اور اس کے لیے بوقت ضرورت قتال بھی کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلاَّ لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ (النساء ۴:۶۴) ہم نے کسی بھی رسول کو نہیں بھیجا مگر اس لیے کہ اس کی اطاعت کی جائے اللہ کے اذن سے۔

سب سے آخری نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے آخری نبی اور رسول بھی تھے اور نامزد حکمران بھی۔ آپؐ نے کتاب و سنت کا نظام دیا اور اپنی زندگی میں خود حکومت کی اور اپنے بعد اپنی امت کو حکومت سپرد فرمائی۔ آپؐ کی امت، آپؐ کی نائب اور خلیفہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ط (ال عمرٰن ۳:۱۱۰) تم تمام امتوں سے بہتر امت ہو جسے انسانوں کی امامت کے لیے نکالا گیا ہے۔ تم معروف کا حکم کرتے ہو اور منکر سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان لائے ہو---- آپؐ کے بعد اللہ تعالیٰ کی طرف سے امت مسلمہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے نائب کی حیثیت سے نامزد حکمران ہے۔ اس پر امت مسلمہ کا اجماع ہے کہ کافر کا اقتدار ناجائز ہے اور کفر کا اقتدار بھی باطل ہے۔ نظام اقتدار کے لیے اللہ تعالیٰ نے اسلامی نظام کو پسند فرما لیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ (ال عمرٰن ۳: ۱۹)۔ اور اس نظام کو چلانے کے لیے امت مسلمہ کو مقرر فرما دیا ہے۔

امت مسلمہ کا کام ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت پر عمل کرتے ہوئے اقتدار کے لیے کوشش کرے۔ امت مسلمہ کا اقتدار نبیؐ کی خلافت اور نیابت ہے، اور کتاب و سنت کی حکمرانی حکومت الٰہیہ کا دوسرا نام ہے۔ چنانچہ امت مسلمہ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اپنے منصب کے تقاضے کو پورا کرتے ہوئے ایسا کیا۔ اس وقت دنیا میں ۶۰ کے قریب جو مسلمان ممالک ہیں وہ امت مسلمہ کے جہاد کا نتیجہ ہیں۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ امت مسلمہ تو اقتدار اور خلافت کے لیے نامزد ہو گئی لیکن اس امت میں حکومت کی تشکیل کیسے ہو گی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ امت مسلمہ میں حکومت، امت مسلمہ کے انتخاب کے ذریعے عمل میں آئے گی۔ اللہ تعالیٰ نے امت مسلمہ کو تو اقتدار کے لیے نامزد کر دیا ہے لیکن اس کے کسی فرد کو کسی بھی دور میں حکومت کے لیے نامزد نہیں کیا۔ ابوبکرؓ و عمرؓ اور عثمانؓ و علیؓ خلفائے راشدین بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے نامزد نہیں تھے بلکہ امت مسلمہ کے منتخب کردہ تھے۔ ان کے بعد بھی کوئی نامزد نہیں ہے بلکہ منتخب ہو گا۔ البتہ صفات کے لحاظ سے تعین کر دیا گیا ہے کہ امت ان صفات سے متصف افراد میں سے کسی کا انتخاب کرے اور جو ان صفات سے متصف نہ ہو اس کا انتخاب معتبر نہ ہو گا۔ لَا يَنَالُ عَهْدِي الظّٰلِمِيْنَ ○ (البقرہ ۲: ۱۲۴) میرا وعدہ ظالموں سے نہیں ہے---- ظالم خلیفہ، امیر، قاضی اور حاکم نہیں ہو سکتا (ابوبکر جصاص)۔

اس بات پر اہل سنت والجماعت کا اجماع ہے۔ شیعہ حضرات امامت کو نامزد قرار دیتے ہیں اور امام ان

کے نزدیک معصوم ہوتا ہے۔ لیکن اہل سنت والجماعت کے نزدیک امامت انتخاب سے وجود میں آتی ہے۔ یہ بنیادی نظریہ ہے جو شیعہ اور اہل سنت والجماعت میں امتیاز پیدا کرتا ہے۔ مفتی محمد شفیعؒ آیت وَاِذْ قَالَ رَبُّکَ لِلْمَلٰٓئِکَۃِ (البقرہ ۲: ۳۰) کی تفسیر میں فرماتے ہیں: ''اس آیت سے ایک اصول یہ نکلتا ہے کہ اقتدار اعلیٰ اللہ جل مجدہ کے لیے ہے۔ دوسرا اصول یہ نکلتا ہے کہ اللہ کا نبی اور رسول، اللہ کا خلیفہ ہوتا ہے۔ تیسرا اصول یہ نکلتا ہے کہ امت مسلمہ میں حکومت انتخاب کے ذریعے قائم ہوگی۔ انتخاب کے ذریعے اسلامی حکومت کا قائم ہونا قرآن پاک کی متعدد آیات سے ثابت ہے۔ ان آیات میں سے ایک آیت سورۃ شوریٰ کی ہے کہ وَاَمْرُھُمْ شُوْرٰی بَیْنَھُمْ (الشوریٰ ۴۲: ۳۸) ''ان کی حکومت باہمی مشورے سے قائم ہوتی ہے''۔ اسی اصول کی روشنی میں جو قرآن پاک کی آیات سے مستنبط اور ثابت ہے اور جس پر امت مسلمہ کا اجماع ہے، ضروری تھا کہ خلافت راشدہ کے بعد بھی خلافت اور امامت مسلمانوں کے مشورے اور انتخاب سے عمل میں آتی۔ باپ کے بعد بیٹے کی حکومت کا سلسلہ قائم نہ ہوتا لیکن یہ بات قابل افسوس ہے کہ اسلام کا یہ ایک حکم خلافت راشدہ کے بعد معطل ہوگیا۔ لیکن امت اس سے غافل نہیں رہی۔

صحابہؓ کے دور سے لے کر ہر دور میں خلافت اور مسلمانوں کے مشورے سے حکومت قائم کرنے کے لیے جدوجہد ہوتی رہی اور امربالمعروف کا فرض ادا ہوتا رہا۔ جن لوگوں نے اس اصول کو قائم کرنے کے لیے کوشش کی انھوں نے اسلام کے حکم کو قائم کرنے کی کوشش کی۔ انھوں نے اپنے ذاتی اقتدار کے لیے کوشش نہیں کی۔ جنگ جمل و صفین تو صحابہؓ کے درمیان غلط فہمی کا نتیجہ تھیں اور کربلا کا واقعہ حصول اقتدار کے فتنے کا نتیجہ نہ تھا بلکہ وَاَمْرُھُمْ شُوْرٰی بَیْنَھُمْ کے حکم قرآنی کے مطابق حکومت قائم کرنے کی پرامن کوشش تھی۔ ظلم ان لوگوں نے کیا جنھوں نے اس حکم کے لیے کوشش کرنے والی شخصیت حضرت امام حسینؓ پر فوج کشی کر کے انھیں شہید کر ڈالا۔ اس کے بعد بنو امیہ، بنو عباس اور بنو عثمان کی حکومتیں قائم ہوئیں جو خلافت کے نام سے ملوکیت تھیں۔ ان میں نظام تو کتاب و سنت کا جاری تھا لیکن حکومت انتخاب سے نہیں بلکہ خاندانی وراثت کے طور پر وجود میں آتی تھی۔ اسی ملوکیت کا نتیجہ بالآخر سقوط بغداد اور سقوط خلافت کی صورت میں سامنے آیا۔

آج صورت حال یہ ہے کہ ایک اسلامی ریاست ۶۰ کے قریب مملکتوں میں تقسیم ہوگئی ہے۔ ریاست کا جو نظام اسلام کی شکل میں رائج تھا، معطل ہوگیا۔ بعض ممالک (جیسے ترکی) میں اسلام خلاف قانون ہوگیا، اور اقتدار ان لوگوں کے پاس آگیا جو کتاب و سنت کی رو سے اقتدار کے لیے اہلیت نہیں رکھتے۔ اب مسلمانوں کو ایک طرف تو خلافت اسلامیہ کو بحال کرنا ہے اور اس کے لیے اسلام کی بنیاد پر ممالک اسلامیہ کو متحد کرنا ہے اور دوسری طرف اپنے اپنے ملک میں ایسی حکومت قائم کرنا ہے جو قرآن پاک کے بیان کردہ معیار پر پورا اترنے والی ہو جسے ہم شرعی حکومت کہہ سکیں۔ یہ وہ کام ہیں جو ہمیں کرنے ہیں۔ یہ صرف

۱۱۱۱۵

بسم اللہ الرحمن الرحیم

قاضی حسین احمد

امیر جماعتِ اسلامی پاکستان

حوالہ: ۱۹ / ۵ / ۹۹
تاریخ: ۲ جمادی الثانی ۱۴۲۰ھ
۱۳ ستمبر ۱۹۹۹ء

مکرمی و محترمی

السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ

ماہنامہ ترجمان القرآن نے تحریک اسلامی میں ہمیشہ رہنمائی کا کردار ادا کیا ہے۔ سید مودودی کی اس یادگار کو ہمارے محترم بھائی خرم مراد نے ظاہری اور باطنی محاسن سے آراستہ کر کے مقبول عام بنایا۔ اب پروفیسر خورشید احمد کی ادارت میں' جنھیں جماعت اسلامی میں علمی اور فکری لحاظ سے رہنمائی کا مقام حاصل ہے' مسلسل پیش رفت کر رہا ہے۔

خرم بھائی نے کئی بار کہا کہ اگر ہم میں سے ہر ایک اپنے حصے کا کام کرے اور ہر اس شخص تک ترجمان القرآن پہنچائے جس تک اسے پہنچنا چاہیے' تو اس کی اشاعت کا ایک لاکھ تک پہنچنا ایک قابل حصول ہدف ہو گا۔

ترجمان القرآن کی جانب سے اکتوبر' نومبر' دسمبر ۱۹۹۹ء میں اشاعت میں اضافہ کی خصوصی مہم چلائی جا رہی ہے۔ میری ہر کارکن سے اور نظم کی کسی بھی سطح کے ہر ذمہ دار سے یہ اپیل ہے کہ وہ جماعت اسلامی کے منصوبہ عمل میں' تحریکی رسائل کے بارے میں طے شدہ نکات کو سامنے رکھ کر اپنے لیے منصوبہ بنائیں اور واضح اہداف متعین کریں کہ وہ اشاعت کو کتنا بڑھا سکتے ہیں۔ ترجمان القرآن کی انتظامیہ کی جانب سے بھی آپ کو ہدایات ملیں گی' انھیں پیش نظر رکھیں۔

ترجمان کی اشاعت میں اضافہ ہمارے دعوتی کام میں اضافہ ہے۔ جہاں یہ پہنچے گا ہماری دعوت کے لیے قلوب و اذہان کو مسخر کرے گا۔ کارکنوں کی تربیت میں اس کا واضح کردار ہے۔ اس کا باقاعدہ مطالعہ کرنے والے ہمارے بہتر کارکن ہوتے ہیں۔ اس مہم پر اپنے مالی وسائل صرف کرنے میں تساہل نہ برتیں۔ یہ رسالہ ہمیں نئے انسانی وسائل فراہم کرے گا اور ہماری سرمایہ کاری کئی گنا ہو کر واپس ملے گی۔

اور آخرت کا اجر تو ہے ہی۔ اور وہی بہتر اور باقی رہنے والا اجر ہے۔

والسلام

(قاضی حسین احمد)

کوئی کتنے ہی اعلیٰ منصب پر ہو
کتنا ہی عام سا آدمی ہو
ہم ہر ایک سے
اگر وہ ترجمان القرآن کے پیغام میں دلچسپی رکھتا ہے
تعاون کی امید بلکہ یقین رکھتے ہیں
زبانی کلامی نہیں...... عملی!!

آپ ارادہ کر لیں کہ اشاعت بڑھانا ہے

تدابیر آپ کو خود سوجھیں گی
آپ کا ارادہ نہ ہو'
ہماری بتائی تدبیریں رکھی رہ جائیں گی

ہم صرف لالچ دے سکتے ہیں

صرف ۱۵۰ روپے میں' ۱۲ ماہ تک ۸۸ صفحات کا معیاری نگارشات کا مجموعہ
برا سودا نہیں!
کسی کو ہدیہ کریں...... ۱۲ ماہ آپ کی اچھی یاد دلائے گا
مطالعہ سے کسی کی زندگی بدلے' کوئی نیکی کرے' آپ کا بھی اجر میں حصہ ہو گا
اس صدقہ جاریہ کے اجر کی انتہا نہیں

پھر کوشش میں کمی کیوں کریں؟

اپنا ہدف طے کیجیے: ۱' ۵' ۱۰' ۲۰' ۵۰ --- کچھ بھی ناممکن نہیں۔
صرف نیت' ارادہ اور کوشش شرط ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

محترم مینیجر صاحب، السلام علیکم!

ازراہ کرم، درج ذیل پتوں پر ترجمان کا نمونے کا پرچہ / تعارفی بروشر ارسال کر دیں۔ امید ہے کہ یہ خریدار بن جائیں گے۔ نام ________

پتا ________

نام ________

پتا ________

شہر / مقام ________ | | | | | |

نام ________

پتا ________

شہر / مقام ________ | | | | | |

نام ________

پتا ________

شہر / مقام ________ | | | | | |

نام ________

پتا ________

شہر / مقام ________ | | | | | |

[illegible]

محترم مینیجر صاحب، السلام علیکم!

میں ماہ ________ سے سالانہ خریدار بننا چاہتا / چاہتی ہوں۔ مطلوبہ رقم ________

بذریعہ بنک ڈرافٹ / منی آرڈر ارسال ہے / کا وی پی کر دیجیے

نام ________

پتا ________

شہر / مقام ________ ☐☐☐☐☐

محترم مینیجر صاحب، السلام علیکم!

درج ذیل پتے پر ایک سال کے لیے میری جانب سے بطور ہدیہ جاری کر دیجیے۔ -/150 روپے بذریعہ بنک ڈرافٹ / منی آرڈر ارسال ہیں۔

بھیجنے والے کا نام ________

پتا ________

نام ________

پتا ________

شہر / مقام ________ ☐☐☐☐☐

اندرون ملک

1 سال	Rs.150
2 سال	280
3 سال	420

بیرون ملک

	1 سال	2 سال	3 سال
1- بھارت	Rs. 300	Rs. 590	Rs. 870
2- بنگلہ دیش، ایران	450	880	1320
3- مشرق وسطیٰ، یورپ مشرق بعید، افریقہ	650	1280	1920
4- امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا	900	1780	2670

- بیرون لاہور بنک کے چیک میں 52 روپے کا اضافہ کر دیجیے۔
- بیرون ملک کے بنک کے چیک ارسال نہ کیے جائیں۔

یہ ورق جدا کر کے لفافے میں رکھ کر ٹکٹ چسپاں کر کے حوالہ ڈاک کر دیجیے۔

ایک کام نہیں ہے۔

بہت سے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ صرف نظریاتی کام کرنا چاہیے' اسلامی نظام اور اعلاے کلمۃ اللہ کے لیے آواز بلند کرنا چاہیے اور اس کے لیے دعوت دیتے رہنا چاہیے' اقتدار کی کش مکش میں پڑنا صحیح نہیں ہے۔ یہ ان لوگوں کی غلط فہمی ہے۔ اگر صرف نظام غیر اسلامی ہوتا تب تو یہ بات کہی جا سکتی تھی کہ اسلامی نظام کے لیے آواز بلند کی جائے۔ لیکن اس وقت نظام اسلامی بھی معطل ہے اور حکمران بھی شرعی معیار پر پورا نہیں اترتے۔ اس لیے جہاں ایک طرف اسلامی نظام کے قیام کے لیے کوشش کی جائے گی وہاں حکمران جو کہ ظالم اور فاسق ہیں' شریعت کے معیار پر پورا نہیں اترتے' انھیں بھی ہر ممکن طریقے سے برطرف کر کے ان کی جگہ صالحین کو برسر اقتدار لانا ضروری ہے۔ نبیؐ کے بعد اسلام کا پہلا حکم جو قائم کیا گیا وہ شریعت کی روشنی میں حکومت اسلامی کا قیام تھا۔ حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ و عثمانؓ و علیؓ خلفا منتخب ہوئے اور خلافت راشدہ کا نظام قائم ہوا۔ جب یہ نظام خلافت' ملوکیت کی طرف منتقل ہونے لگا تو پھر بعض صحابہ کرامؓ نے جن میں امام حسینؓ سرفہرست ہیں' نظام خلافت کو بچانے کے لیے کوشش کی۔ اس کے بعد چاہیے تو یہ تھا کہ اس مسئلے کے بارے میں دو رائیں نہ ہوتیں اور لوگ اسلامی حکومت کے قیام کو اولین دینی فریضہ سمجھتے۔ لیکن افسوس ہے کہ اب بھی بعض لوگ اسے حصول اقتدار کا فتنہ قرار دے رہے ہیں حالانکہ یہ سنت انبیا علیہم السلام ہے کہ انھوں نے بھی اپنے دور میں اقتدار کے لیے کوشش کی ہے۔ اس لیے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکمرانی کے لیے نامزد تھے اور اقتدار کے حق دار تھے۔ اب دور نبوت کے بعد امت مسلمہ کا کفر کے اقتدار کے خلاف جہاد کرنا بھی سنت انبیا ہے' اور امت مسلمہ کے اندر شرعی حکومت قائم کرنے کی کوشش بھی حق دار کو اس کا حق دلانے کی کوشش ہے اور سنت انبیا پر عمل کرنا ہے۔

پاکستان میں شرعی حکومت کے قیام کے لیے کوشش کا دروازہ کھلا ہے۔ ہر پانچ سال بعد انتخاب ہوتا ہے لیکن انتخابات میں ایسے لوگ حصہ لیتے ہیں جو اقتدار کے اہل نہیں ہیں۔ ایسے لوگوں کے خلاف اہل لوگوں کا میدان میں آنا فرض ہے اور شریعت کا تقاضا ہے۔ جو لوگ اسے فتنہ سمجھتے ہیں انھیں کتاب و سنت کی تعلیمات اور انبیا علیہم السلام کی سنت اور دین کے مقاصد کا علم نہیں ہے۔ جماعت اسلامی پاکستان اسی نظریے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے جدوجہد کر رہی ہے۔ وہ یہ نہیں چاہتی کہ صرف ایسے لوگ برسر اقتدار آئیں جن پر جماعت اسلامی کا ٹھپہ لگا ہو بلکہ وہ یہ چاہتے ہیں کہ ایسے لوگ برسر اقتدار آئیں جو شریعت کے معیار پر پورا اترتے ہوں۔ اسی بنیاد پر جماعت اسلامی نے دستور پاکستان کی دفعہ ۶۲' ۶۳ کے مطابق انتخاب کرانے کا مطالبہ کیا تھا۔ جماعت اسلامی نے یہ مطالبہ کب کیا تھا کہ انتخاب میں ہم اسی وقت حصہ لیں گے جب میدان میں صرف جماعت اسلامی کے لوگ ہوں؟ کیا جماعت اسلامی نے یہ مطالبہ کیا تھا کہ عوام صرف جماعت اسلامی کے لوگوں کو منتخب کریں؟ یا یہ مطالبہ کیا تھا کہ ایسے لوگوں کو منتخب کریں جو دفعہ

۶۲ اور ۶۳ کے معیار پر پورا اترتے ہوں خواہ ان کا تعلق کسی بھی جماعت سے ہو' چاہے وہ جماعت اسلامی میں شامل ہوں یا نہ ہوں؟

محترم آپ ذرا غور فرمائیں تو آپ پر اپنی غلطی واضح ہو جائے گی۔ جماعت اسلامی: وَاَمۡرُهُمۡ شُوۡرٰى بَيۡنَهُمۡ (الشوریٰ ۴۲: ۳۸)' اِنَّ الدِّيۡنَ عِنۡدَ اللّٰهِ الۡاِسۡلَامُ قف (ال عمرٰن ۳:۱۹)' وَاعۡتَصِمُوۡا بِحَبۡلِ اللّٰهِ جَمِيۡعًا وَّلَا تَفَرَّقُوۡا ص (ال عمرٰن ۳: ۱۰۳) اور وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا مِنۡكُمۡ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسۡتَخۡلِفَنَّهُمۡ فِى الۡاَرۡضِ كَمَا اسۡتَخۡلَفَ الَّذِيۡنَ مِنۡ قَبۡلِهِمۡ ص وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمۡ دِيۡنَهُمُ الَّذِى ارۡتَضٰى لَهُمۡ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِ خَوۡفِهِمۡ اَمۡنًا ط يَعۡبُدُوۡنَنِىۡ لَا يُشۡرِكُوۡنَ بِىۡ شَيۡـئًا ط وَمَنۡ كَفَرَ بَعۡدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓـئِكَ هُمُ الۡفٰسِقُوۡنَ ۝ (النور ۲۴:۵۵) کے مطابق نظام انتخاب کے ذریعے شرعی حکومت اور اسلامی نظام کے قیام' اتحاد امت اور احیائے خلافت' اور مومنین صالحین کے ذریعے حکومت الٰہیہ کے قیام کے لیے کوشش کر رہی ہے۔ وہ مسلمانوں کو متوجہ کرتی ہے کہ فاسقین کا اقتدار شریعت کی خلاف ورزی ہے۔ اپنے ووٹ کے حق کو شریعت کے مطابق استعمال کرو کیونکہ شریعت کی مقررہ حدود کی خلاف ورزی کر کے ظالم اور فاسق کو ووٹ دینا' ناجائز اور غیر معتبر ہے۔ اس کے بارے میں قیامت کے روز جواب دہی کرنا پڑے گی۔

حصول اقتدار صالحین کے لیے حرام نہیں ہے۔ یہ بات غلط ہے کہ اقتدار کے لیے کوشش کرنا نااہلی کی نشانی ہے۔ یہ نظریہ قرآن و حدیث کی تعلیمات سے بے خبری کا نتیجہ ہے۔ نااہلی تب ہے جب ذاتی بڑائی کے لیے کوشش کی جائے اور اس کی خاطر اقتدار کی حرص اور لالچ کی جائے۔ لیکن اگر حکومت الٰہیہ کی خاطر حصول اقتدار کی کوشش کی جائے تو یہ نہ صرف جائز بلکہ سنت انبیا علیہم السلام ہے اور یہ کوشش ایک دینی فریضہ ہے۔ اس کوشش میں حصہ نہ لینا جرم اور گناہ ہے۔ یہ کوشش اس وقت ناپسندیدہ ہے جب آدمی اپنے سے اہل تر کے مقابلے میں اقتدار کی طلب کرے۔ اسی لیے جماعت اسلامی دینی جماعتوں اور اسلام کے علم برداروں کے مابین مقابلے کی مخالف ہے۔ اسی لیے وہ کوشش کرتی ہے کہ انتخاب میں ایسی جگہ کسی کو نامزد کرے جہاں کوئی دوسرا اہل تر آدمی موجود نہ ہو۔

افسوس کی بات ہے کہ قیام پاکستان کے بعد سے برسراقتدار طبقے نے بہت سی چالوں سے نیک لوگوں کو اقتدار سے دور رکھ کر اقتدار کے مزے لوٹتے رہنے کی کوشش کی ہے۔ ان چالوں میں سے ایک چال دینی جماعتوں کو آپس میں لڑانا ہے۔ دوسری چال مذہب اور سیاست کی تفریق ہے کہ دین کا اقتدار سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اور تیسری چال یہ کہ دین دار لوگوں کا اقتدار کے لیے کوشش کرنا ٹھیک نہیں ہے۔ اسلامی تحریک کو ان تمام سازشوں کو ناکام کر کے اللہ کے دین کو قائم کرنا اور نظام خلافت کو بحال کرنا ہے۔ آپ کو چاہیے کہ ان تمام سازشوں سے باخبر رہیں۔ اس کے لیے اہل علم سے رابطوں کو مضبوط اور مستحکم کریں' اور یکسو ہو کر لادین لوگوں کو اقتدار سے برطرف کر کے نیک لوگوں کو برسراقتدار لانے میں جماعت کا ساتھ دیں۔

جہادِ کشمیر اور خواتین

پروفیسر شمیم شال ٥

پالیسی بنانے والے اپنی پالیسیاں پانچ سال کے لیے نہیں بلکہ طویل مدت کے لیے بناتے ہیں۔ وہ اس بات کا جائزہ لیتے ہیں کہ آیندہ سو سال کے لیے کیا حکمت عملی اپنائی جائے جس کے مطابق عمل کر کے اپنے اہداف حاصل کیے جا سکیں۔ اس بات کا جائزہ لینے کی ضرورت ہے کہ قیام پاکستان سے قبل ہندو کی کیا سوچ تھی اور ان کی نظر کہاں تک تھی؟

۱۴/اگست ۱۹۴۷ء مسلمانوں کے لیے یہ بہت مبارک دن تھا لیکن اس موقع پر اس وقت کے کانگریس کے صدر آچاریہ کرپلانی نے بی بی سی سے انٹرویو میں کہا: ۱۴/اگست ۱۹۴۷ء یہ غم اور پریشانی کا دن ہے۔ بھارت کی تاریخ کا بدترین دن ہے۔

انسٹی ٹیوٹ آف پبلک افیرز کے صدر آر۔پی۔کپور نے اعتراف کیا کہ ہمیں صاف گوئی سے کام لینا چاہیے اور تسلیم کرنا چاہیے کہ پاکستان کے خلاف ہمارے تحت الشعور میں نفرت موجود تھی، اور یہ کہ پاکستان ہم سے چھین کر بنایا گیا۔ یہی وہ پیغام ہے جسے ہمیں نسل در نسل پہنچانا ہے۔

ہندو کے پیش نظر محض یہ نہیں تھا کہ مسلمانوں نے سیکڑوں سال ہم پر حکمرانی کی، ہمارے ملک کو ٹکڑے ٹکڑے کیا اور اسلام کے نام پر ملک پاکستان بھی حاصل کر لیا بلکہ ان کی نظر اس بات پر بھی تھی کہ آیندہ سالوں میں پاکستان کا کیا مقام ہو گا اور وہ کیا کردار ادا کر سکے گا؟ یہ ہندو کی دور اندیشی تھی مگر ہم مطمئن ہو کر بیٹھ گئے۔ یہی وہ بنیادی فرق ہے جو ہندو اور مسلم قوم میں، بھارت اور پاکستان دونوں مملکتوں میں پایا جاتا ہے۔

ایک موقع پر آچاریہ کرپلانی نے لارڈ ماؤنٹ بیٹن سے گفتگو کرتے ہوئے قیام پاکستان کے متعلق کہا تھا کہ حالات یہ بتا رہے ہیں کہ ایک وقت آئے گا جب پاکستان امت مسلمہ کی قیادت کا کردار ادا کرے گا۔

---

٥ صدر، کشمیر وومن فورم، راولپنڈی

آج ۵۰ سال بعد بھی ہندوؤں کے مسلمانوں کے خلاف وہی جذبات ہیں۔ وہی سوچ آج بھی کارفرما ہے' وہی خون آج بھی ان کی رگوں میں گردش کر رہا ہے اور وہی برہمن ازم آج بھی برسرپیکار ہے۔

جنگ عظیم دوم کے موقع پر چرچل کے سیکرٹری سے پوچھا گیا کہ اب ہم کافی آگے بڑھ چکے ہیں' یہودیوں کی نسل کشی بھی ہو چکی ہے' تو کیا ہمیں مزید آگے بڑھنا چاہیے؟ اس نے کہا کہ ہم ان یہودیوں کو یوں ہی نہیں چھوڑیں گے انھیں سبق سکھانا ہے۔ ہمیں دوسرا سبق مسلمانوں کو سکھانا ہے لیکن موجودہ مسلمانوں کو نہیں جو اس وقت دب چکے ہیں۔ ہمیں آنے والے سو برسوں کے لیے سوچنا ہے' جب مسلمان ابھر کر سامنے آئیں گے۔ ان مسلمانوں کو ہمیں سبق سکھانا ہے۔ اس کے لیے ہمیں اب تیاری کرنا ہے--- یہ باتیں ۱۹۴۵ میں کی جا رہی ہیں جب مسلمانوں کی کوئی حیثیت ہی نہیں تھی۔

اب تیاری مکمل ہو چکی ہے۔ عالم اسلام کے خلاف سازشیں کی جا رہی ہیں۔ اس میں بھارت' امریکہ' جی-ایٹ ممالک' سب شامل ہیں۔ پاکستان کے خلاف بھی سازشیں مسلسل جاری ہیں۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پاکستان کو ختم کرنے اور توڑنے کی سازشوں کے لیے مقبوضہ کشمیر ہی کا انتخاب کیوں کیا گیا ہے؟

اس سوال کا جواب ۱۹۴۷ ہی سے ہر صاحب بصیرت کو مل رہا تھا۔ اب گذشتہ چند ماہ میں یہ بہت واضح طور پر سامنے آگیا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ پاکستانی عوام کو اس کی اہمیت سے آگاہ نہیں کیا گیا' انھیں بے خبر رکھا گیا' ان پر اس حقیقت کو کھولا ہی نہیں گیا کہ پاکستان کے لیے کشمیر کی کیا اہمیت ہے اور سازشوں کے لیے انتخاب آخر کشمیر ہی کا کیوں کیا گیا؟ اس سوال کا بغور جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔

تقسیم برعظیم کے فوراً بعد ہی پاکستان کے خلاف سازشوں کا آغاز کر دیا گیا۔ جوناگڑھ کی ریاست پر بھارت نے قبضہ کر لیا تو اہل کشمیر خاموش رہے۔ دوسری ریاستوں پر قبضہ کیا گیا تو اہل کشمیر خاموش رہے۔ جب پاکستان کو توڑ کر بنگلہ دیش بنا دیا گیا تو بھی کشمیری خاموش رہے لیکن جب بھارت نے کشمیر پر نظریں جمائیں تو کشمیری خاموش نہ رہ سکے۔ آخر کیوں؟

کشمیر کی جغرافیائی حیثیت پاکستان کے لیے بہت اہمیت کی حامل ہے۔ قائداعظمؒ کا اسے ''شہ رگ قرار'' دینا بجا تھا۔ فی الواقع کشمیر پاکستان کے لیے شہ رگ کی حیثیت رکھتا ہے۔ کشمیر سے پاکستان کی سلامتی وابستہ ہے۔ اب یہ حقیقت ساری دنیا پر واضح ہو چکی ہے۔

آج دنیا کی حکمت عملی تبدیل ہو رہی ہے۔ امریکہ پوری دنیا پر اپنی بالادستی کا خواب دیکھ رہا ہے۔ امریکہ نہیں چاہتا کہ چین جو اس خطے میں ایک قوت ہے اور اس سے مقابلے کی طاقت رکھتا ہے وہ اقتصادی طور پر مستحکم ہو اور ٹکنالوجی میں پیش رفت کر کے غلبہ حاصل کر سکے۔ وہ نہیں چاہتا کہ چین اس خطے میں سر اٹھا سکے اور اس کے مقابلے میں کھڑا ہو سکے۔ چین ایک قوت ہے۔ حال ہی میں تائیوان کے مسئلے میں' اس نے یہ اعلان کیا ہے کہ تائیوان کو خالی کروانے کے لیے اس کی فوجیں ہتھیار اٹھائے بغیر

آگے بڑھیں گی۔ اسے لڑنے کی ضرورت نہیں ہے، دہشت ہی کافی ہے۔ یہی چین کا وہ بڑھتا ہوا کردار ہے جس سے امریکہ خائف ہے۔ اس کو آگے بڑھنے سے روکنے کے لیے وہ بھارت کی پشت پناہی کر رہا ہے۔ ان حالات کے پیش نظر اپنی جغرافیائی حیثیت کی بنا پر کشمیر بہت زیادہ اہمیت اختیار کر گیا ہے۔ مگر افسوس اس بات کا ہے کہ اس سودا بازی میں اگر کوئی استعمال ہو رہا ہے تو وہ پاکستان ہے۔

ہماری بدقسمتی ہے کہ ہم نے اپنے جغرافیہ اور تاریخ کو سمجھا ہی نہیں۔ تقسیم برعظیم کی بنیاد ہی یہ تھی کہ مسلم اکثریتی علاقوں کا الحاق پاکستان سے ہو گا اور ہندو اکثریتی علاقوں کا الحاق بھارت سے۔ ریاستوں کو اس بات کا اختیار دیا گیا تھا کہ وہ اپنے الحاق کا فیصلہ خود کر سکتی ہیں۔ یقیناً مسلم اکثریتی ریاستوں کو پاکستان کے ساتھ ہی الحاق کرنا تھا۔ اس خدشے کے پیش نظر بھارت نے جوناگڑھ اور دیگر مسلم اکثریتی ریاستوں پر قوت و جبر سے قبضہ کر لیا۔ کشمیر کی ۹۰ فی صد آبادی مسلمان تھی۔ بھارت نے اس بات کو دیکھتے ہوئے دھوکے اور دھونس سے کشمیر پر قبضہ کر لیا۔ ان کے پیش نظر یہ بات تھی کہ آیندہ دو سو برسوں میں سائنسی ترقی کے نتیجے میں جب حکمت عملی تبدیل ہو گی تو فوج کشی کے بغیر ہی ملکوں کو فتح کیا جا سکے گا۔ اس وقت پاکستان کو کشمیر پر قبضے کے ذریعے تباہی سے دوچار کرنا آسان ہو گا۔ یہ بات آج ایک حقیقت ہے۔

کشمیر، پاکستان کی سلامتی و بقا کے لیے جس اہمیت کا حامل ہے، اہل کشمیر کو پہلے روز ہی سے اس کا اندازہ ہے۔ اسی لیے وہ پاکستان کے تحفظ کے لیے سرگرم عمل اور سراپا احتجاج رہے۔ مگر جب بدلتے ہوئے تناظر میں، ایک نئی حکمت عملی کے تحت بھارت نے پاکستان کے خلاف سازشوں کا ایک نیا جال بننا شروع کیا تو کشمیریوں نے محسوس کیا کہ اب فیصلہ کن مرحلہ آن پہنچا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ۱۹۸۵ میں، ایک طویل سیاسی جدوجہد کے بعد، پرامن مظاہروں، احتجاجی جلوس، مذاکرات، انتخاب کے ذریعے اپنی آواز بلند کرنے کی کوشش اور دیگر تمام امن پسند، سیاسی و صحافتی ذرائع اپنانے کے بعد جب اہل کشمیر کو اس بات کا بخوبی احساس ہو گیا کہ بھارت اس تمام تر جدوجہد کے باوجود کشمیریوں کے بنیادی حقوق اور حق خود ارادیت دینے پر تیار نہیں ہے، اور استصواب رائے کے وعدے کی مسلسل خلاف ورزی کرتا چلا آ رہا ہے تو بالآخر انھوں نے انتہائی اقدام کرنے کا فیصلہ کیا۔ اہل کشمیر کو اس بات کا بھی بخوبی اندازہ ہو گیا تھا کہ موجودہ حالات میں ہماری آزادی تو گئی ہی گئی ہے مگر پاکستان کے وجود کو بھی شدید خطرہ لاحق ہو گیا ہے۔ اس لیے کہ اب وہ وقت آگیا تھا جب بھارت نے پاکستان کے خلاف "واٹر بم" استعمال کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

"واٹر بم" کیا ہے؟ یہ پاکستان کے خلاف ایک بھیانک سازش ہے۔ اس کا مقصد پاکستان کے ان دریاؤں کا رخ، جن کا منبع کشمیر ہے، موڑ دیا جائے اور پاکستان کو پانی سے محروم کر کے بنجر بنا دیا جائے۔ اس سے قبل "سندھ طاس" معاہدے کے تحت پاکستان اپنے تین دریاؤں سے محروم ہو چکا ہے۔

بھارت کشمیر میں دریاؤں پر بند باندھ کر بہت بڑا بیراج اور بجلی گھر بنا کر اس بجلی کو استعمال کر رہا ہے۔

جموں میں سلال پراجیکٹ ہے' جو دنیا کی بلند ترین چوٹیوں پر بنایا گیا ہے۔ اس کی افادیت کشمیر کے لیے نہیں ہے بلکہ یہ اس لیے بنایا گیا تھا کہ پاکستان کی سرزمین کو آہستہ آہستہ خشک کر کے بنجر کر دیا جائے۔ یہ پہلا مرحلہ تھا۔ دوسرے مرحلے میں' دریاے جہلم جس کا بہاؤ قدرتی طور پر پاکستان کی طرف ہے اور جس کا رخ موڑنا ناممکن ہے' اس پر بند باندھنے کا فیصلہ کیا گیا۔ "وولر بیراج" کے نام سے اس دریا پر ایک بیراج بنانے کا فیصلہ کیا گیا۔ ۱۹۸۵ میں جب اس بیراج کی تعمیر کا ابتدائی کام شروع ہو رہا تھا' یہ وہی وقت تھا جب اہل کشمیر نے مسلح جہاد کرنے کا فیصلہ کیا۔

"وولر بیراج" کے بن جانے کا مطلب یہ تھا کہ دریاے جہلم کے پانی پر بھارت کا قبضہ ہو جائے اور آہستہ آہستہ پاکستان کی زمینوں کو پانی سے محروم کر کے بنجر کر دیا جائے اور پاکستان بھارت کے رحم و کرم پر ہو جائے۔ ۱۹۷۱ (سقوط مشرقی پاکستان) کے بعد بھارت نے یہ دوسری بڑی سازش تیار کی تھی۔ ڈیم بن جانے کے بعد اسے من مانی کا موقع مل جاتا تھا۔ اپنی مرضی سے پانی چھوڑتا' کم یا زیادہ۔ اس کے لیے کشمیر میں ایسی حکومت کی ضرورت تھی جو ان کا ساتھ دے۔ بھارت نے ۱۹۴۷ ہی سے ایسے لوگ تیار کر رکھے تھے جو اس کے آلہ کار کے طور پر کام کریں۔ شیخ عبداللہ اور ان کے حواری اس میں پیش پیش تھے۔ اس سازش کے نتیجے میں دنیا میں بھی اس طرح سے واویلا نہیں ہو سکتا تھا جتنا کہ جنگ یا فوج کشی کے نتیجے میں ہو سکتا تھا۔ بھارت وولر بیراج کے ذریعے دریاے جہلم کا پانی سات سال تک روک کر قحط سالی پیدا کر سکتا تھا' اور سیلاب کے دنوں میں بیراج کے دروازے کھول کر پاکستان کو سیلاب کے پانی میں ڈبو کر ناقابل تلافی نقصان پہنچا سکتا تھا۔ یہ وہ "واٹر بم" تھا جو پاکستان کے خلاف استعمال ہو سکتا تھا۔ یہ ایک گہری سازش تھی جو "وولر بیراج" کی تعمیر کی آڑ میں پاکستان کے خلاف کی جا رہی تھی۔

اس وقت اہل کشمیر بالخصوص نوجوان سر جوڑ کر بیٹھ گئے اور خاموشی سے اس بات کا جائزہ لینے لگے کہ اس سازش کا مقابلہ کیسے کیا جائے۔ انھیں اس بات کا بخوبی اندازہ تھا کہ پاکستان کو اس سازش کا پوری طرح ادراک نہیں ہے۔ اگر ہے بھی تو وہ زیادہ سے زیادہ یہ کر سکتا ہے کہ اس کے خلاف انٹرنیشنل کورٹ آف جسٹس میں جائے اور مقدمہ دائر کرے۔ جب تک اس مقدمے کی کارروائی آگے بڑھے گی' دنیا کے علم میں آئے گا' اس کا فیصلہ ہو گا' اس وقت تک ڈیم بن جائے گا۔ پھر بھارت پانی کو روکے گا اور من مانی کرے گا۔ وہ یہ کہہ سکتا ہے کہ ہمیں اپنے ملک کی ضروریات کے لیے پانی کی ضرورت ہے۔ اس لیے ڈیم بنانا ہمارے لیے ناگزیر ہے' یا سندھ طاس کی طرح کا کوئی معاہدہ ہو جائے گا جس کا نقصان پاکستان کو ہی ہو گا۔

یہ وہ صورت حال تھی جس میں کشمیری نوجوانوں اور مجاہدوں نے ہتھیار اٹھانے کا فیصلہ کیا۔ یہ فیصلہ کرتے ہوئے بھارتی جارحیت کی ۵۰ سالہ تاریخ بھی ان کے پیش نظر تھی۔ چنانچہ کشمیر میں پہلا دھماکا "وولر بیراج" پر ہوا۔ اس کے نتیجے میں ۱۸ کروڑ ڈالر کا بنیادی تعمیراتی کام رات کے اندھیرے میں نیست و نابود ہو

کر رہ گیا۔ اس دھماکے کے لیے بنیادی کردار ایک خاتون ہی نے ادا کیا جو کشتی چلانے والی تھی۔ اس نے اپنی کشتی میں مجاہدین کو دریا پار کروایا اور خود بھی بم دھماکے کے نتیجے میں اللہ کی راہ میں جان دے کر شہادت کے عظیم مرتبے پر فائز ہو گئی۔ اس طرح تحریک جہاد کا عملاً آغاز ہوا۔

جہاد کشمیر میں خواتین کا کردار کسی سے کم نہیں ہے۔ جیسا کہ آپ نے دیکھا کہ تحریک جہاد کے آغاز ہی میں ایک خاتون نے اہم کردار ادا کیا اور شہادت کا مرتبہ پایا۔ وہ کوئی پڑھی لکھی خاتون نہیں تھی۔ اس کو قرآن کا کچھ زیادہ فہم بھی نہیں تھا۔ اس نے تفہیم القرآن نہیں پڑھ رکھی تھی۔ اس نے کسی خاص دینی ماحول میں بھی پرورش نہیں پائی تھی بلکہ وہ ہندو ثقافت اور ہندو ازم میں پلی بڑھی تھی۔ وہ ۵۰ سال سے بھارت کی جارحیت برداشت کر رہی تھی۔ مگر وہ جانتی تھی کہ اگر اللہ کے لیے جان دے دی جائے تو شہادت ملتی ہے۔ یہی وہ کیفیت اور حالات ہیں جن میں آج کشمیری عورتیں اپنا کردار ادا کر رہی ہیں' اپنی جانیں پاکستان کے نام پر نچھاور کر رہی ہیں' اور اپنی ذمہ داریوں کو نبھا رہی ہیں۔

آج ۵۰ ہزار کشمیری نوجوان اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کر چکے ہیں۔ یہ نوجوان ایک ایسے ماحول میں پلے بڑھے ہیں جو بھارتی ثقافت پر مبنی ہے۔ بھارتی فلمیں' بھارتی تہذیب و تمدن' بھارت کا تیار کردہ نصاب تعلیم اور نظام تعلیم اور بھارتی معیشت کا انھیں سامنا ہے۔ مگر اللہ نے ان کے دل میں یہ بات ڈال دی کہ کشمیر صرف اہل کشمیر کے لیے ہی اہم نہیں ہے بلکہ امت مسلمہ کے لیے نہایت اہمیت کا حامل ہے۔ ۲۱ ویں صدی میں پاکستان کو امت مسلمہ کے امام کا کردار ادا کرنا ہے' اس کے دفاع' حفاظت اور تکمیل کے لیے ہمارے ۵۰ ہزار نوجوان ہی کیا' ہماری پوری آبادی اس کی خاطر قربان ہو جائے گی۔ یہ پوری کشمیری قوم کا فیصلہ ہے۔

ہمیں اس بات پر کوئی غم نہیں' ہم نے اس پر کوئی واویلا نہیں مچایا کہ ۵۰ ہزار کے قریب نوجوان شہید ہو گئے' ۲۰۰ کے قریب ایسی خواتین جو بالکل معصوم تھیں' انھوں نے اپنی عصمتیں دے دیں۔ وہ بچیاں جو اسکولوں میں زیر تعلیم تھیں ان کی عصمتوں تک کو پامال کیا گیا۔ ۸۰' ۸۰ سال کی بوڑھی خواتین تک کی عزت کو تار تار کیا گیا۔ اس لیے کہ ہم نے جب اس حقیقت کو جان لیا کہ بھارت پاکستان کے خلاف جارحیت کرنا چاہتا ہے' تو کشمیر کے نوجوانوں نے اپنی زندگیوں کا قیمتی اثاثہ' خواتین نے اپنے گھر' چادر اور چار دیواری اور اپنی عزتیں صرف اور صرف پاکستان کی تکمیل' اس کی سلامتی اور تحفظ کے لیے قربان کر دیں۔

یہ اللہ کا احسان ہے اور ہم اس پر اس کے شکرگزار ہیں کہ اس آزمایش اور مرحلے میں ہم سرخرو ہو رہے ہیں۔ نتائج کی ذمہ داری ہماری نہیں ہے۔ ہم اس کے لیے جواب دہ نہیں ہیں۔ اللہ نے نبی کریمؐ کو حکم دیا تھا کہ نکلو' اللہ کی راہ میں خواہ ہلکے ہو یا بوجھل۔ آپؐ کو یہ نہیں دیکھنا کہ آپ ۳۱۳ ہیں' آپؐ کے

پاس کچھ نہیں ہے' آپؐ کے پاس سازوسامان نہیں ہے بلکہ آپؐ کو تو اللہ کے حکم کی تعمیل کرنا ہے۔ جو کچھ ہے' اسے اللہ کے بھروسے پر اللہ کی راہ میں کھپا دینا ہے۔ انھوں نے اللہ کے حکم کی تعمیل کی' اللہ کی مدد شامل حال ہوئی اور وہ سرخرو و کامیاب و کامران ٹھہرے۔ عزت' سربلندی اور فتح اور کامیابی نے ان کے قدم چومے۔ آج کشمیریوں نے بھی اللہ کے اس فرمان کی تعمیل کی۔ اللہ ہماری قربانیوں کو قبول فرمائے اور اپنی راہ میں ہمیں استقامت بخشے۔

اہل کشمیر کے لیے پاکستان مکہ اور مدینہ جیسی مقدس سرزمین کی حیثیت رکھتا ہے۔ پاکستان اسلام کی سربلندی اور اللہ کے کلمے کو بلند کرنے کے لیے معرض وجود میں آیا تھا۔ کیا ہوا اگر آج ہم نے اس مقدس سرزمین کے لیے اور پاکستان کی تکمیل کے لیے اپنے بیٹے دے دیے' اپنے بچے قربان کر دیے' عورتوں نے اپنی عزت و آبرو' اپنا سب کچھ لٹا دیا' چھوٹے چھوٹے معصوم بچے قربان کر دیے۔ معصوم بلال جیسے بچے جسے محض اس لیے شہید کر دیا گیا کہ اس نے مجاہدین کا سامان منتقل کرنے میں مدد دی۔ اہل کشمیر نے یہ سب کچھ اس لیے کیا کہ وہ اپنی ذمہ داریوں کو ادا کر سکیں اور اللہ کے ہاں سرخرو ہو سکیں۔

میری بہنو! یہ وہ ذمہ داری ہے جس کا آپ کو احساس کرنا ہے۔ قوم کی سربلندی اور آیندہ نسل کی تربیت وہ اہم ترین ذمہ داری ہے جو آپ کو نبھانی ہے۔ اللہ کے ہاں سب سے زیادہ پوچھ عالموں (جاننے والوں) کی ہو گی۔ آپ وہ ہیں جن پر حقیقت واضح ہو چکی ہے۔ اپنے آپ کو محض گھربار اور دیگر ذمہ داریوں تک محدود کر کے آپ اپنی ان اہم ترین ذمہ داریوں سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتیں۔ آپ کو اپنا کردار بہرحال نبھانا ہو گا۔ یہی وقت کا تقاضا ہے۔

آپ محض خواتین نہیں ہیں بلکہ خواتین اسلام ہیں۔ مسلمان خواتین نے ہر دور میں اپنا کردار ادا کیا ہے' خواہ حالات کچھ بھی تھے' وہ اس کے لیے تیار تھیں یا نہیں تھیں۔ مسلمان خاتون نے حضرت عائشہؓ کی طرح کردار ادا کیا۔ اس نے حضرت خدیجہؓ کی طرح کردار ادا کیا' نبی کریمؐ کی ڈھارس بندھائی' انھیں حوصلہ دیا' جان و مال سب کچھ نچھاور کر دیا۔ اس نے حضرت زینب بن کر بھی دکھایا کہ یزید کے سامنے ننگے پاؤں اور ننگے سر پیش ہوئیں۔ حضرت اسماءؓ کا کردار بھی آپ کے سامنے ہے۔ گویا مسلمان خاتون نے ہر دور میں اپنا کردار ادا کیا ہے' نسلوں کی تربیت کے ذریعے اور اپنے جان و مال اور عزت و آبرو کو قربان کر کے' ہر قسم کی قربانی دے کر۔

وقت آگیا ہے کہ خواتین اپنی ذمہ داریوں کو محسوس کریں اور انھیں مختلف انداز اور صورتوں میں نبھائیں۔ یہ قانون قدرت ہے اور وقت کا فیصلہ ہے۔

معرکہ کارگل نے کشمیر کی صورت حال کو بالکل بدل کر رکھ دیا ہے۔ ہمارے حکمرانوں اور سیاست دانوں نے حکمت و فراست کا مظاہرہ کرنے کے بجائے قومی مفادات پر ذاتی مفادات کو ترجیح دی۔ ان حالات

میں خواتین کی ذمہ داریاں اور بھی بڑھ گئی ہیں۔ انھیں مردوں کو احساس بھی دلانا ہے اور اپنی نسلوں کو تاریخ کا بھولا ہوا سبق بھی یاد دلانا ہے۔ وگرنہ جانتے بوجھتے غفلت برتنے پر اللہ کے ہاں بڑی سخت پوچھ گچھ ہو گی۔

آپ بخوبی جانتی ہیں کہ آپ کے آس پاس' کشمیری مرد و خواتین جو بے بس ہیں' سراپا احتجاج ہیں' اللہ سے دعاگو ہیں کہ اے اللہ! ہم بے بس ہیں' ہم دبائے گئے ہیں' ہمارے مددگار پیدا کر۔ آخر کیا وجہ ہے کہ جب مظلوم کشمیری مدد کے لیے پکارتے ہیں تو ۱۴ کروڑ عوام خاموش رہتے ہیں؟ یہ ایک کروڑ ۲۰ لاکھ کشمیری عوام کی دنیا میں نمایندگی کیوں نہیں کر سکتے ہیں؟ آخر کیا وجہ ہے؟ کیا آپ کی اپنی تاریخ پر نظر نہیں ہے؟ کیا آپ کو اپنے جغرافیہ کی اہمیت کا اندازہ نہیں ہے؟ کیا آپ نے ان کے دکھ کو نہیں جانا یا آپ کو کوئی بتانے والا نہیں آیا؟ ایسا نہیں ہے۔

اہل کشمیر نے اپنی ذمہ داریاں میدان عمل میں بھی پوری کی ہیں اور میدان جہاد میں بھی۔ ذاتی طور پر میں نے بھی اپنی حد تک جہاں جہاں مجھے موقع ملا میں نے جہاد کشمیر کے پیغام کو پہنچایا ہے۔ اب یہ آپ کی ذمہ داری ہے۔ آج تاریخ ہمیں موقع دے رہی ہے۔ اس موقع کو غنیمت جانتے ہوئے اپنی ذمہ داریوں کو پورا کیجیے۔ اگر آج ہم نے یہ ذمہ داریاں نہ اٹھائیں تو کل کوئی اور اٹھا لے گا۔ اللہ اپنے دین کو سربلند کرنے کے لیے' مظلوم کشمیریوں کی قربانیوں کو دیکھتے ہوئے' انھیں ظلم سے نجات دلانے کے لیے کوئی نہ کوئی راہ ضرور نکالے گا۔ ہم اسی کے بھروسے پر اپنی جدوجہد جاری رکھے ہوئے ہیں۔ لیکن اہل پاکستان کو اپنے فرائض کی تکمیل کے لیے جواب دہی کرنا ہو گی۔ ان کی پکڑ ہو سکتی ہے۔ اللہ ہمیں ایسے برے وقت سے بچائے۔ اس لیے آج اپنی ذمہ داریاں ادا کرنے کی فکر کیجیے۔

اہل کشمیر اور کشمیری خواتین نے اپنی ذمہ داریاں کس طرح ادا کی ہیں؟ اس کی چند مثالیں میں آپ کے سامنے پیش کرتی ہوں۔

یہ ۱۹۹۰ کی بات ہے۔ ایک کشمیری خاتون کو اس کے شوہر یہ بتاتے ہیں کہ اس کا بیٹا شہید ہو گیا ہے۔ تھوڑی ہی دیر میں اس بستی کو ۶۰ ہزار بھارتی فوجی گھیر لیتے ہیں۔ کریک ڈاؤن شروع ہو جاتا ہے۔ وہ خاتون اپنے باورچی خانے میں چاولوں میں نمک اور ہلدی ڈال کر بغیر گوشت کے بریانی بنانے میں مصروف ہے کہ روتے ہوئے بچوں کے لیے کچھ کھانا پکا لیا جائے۔ کریک ڈاؤن کے تحت گھر گھر تلاشی لی جا رہی ہے۔ مردوں کو گھروں سے باہر نکال لیا گیا ہے اور ان پر تشدد کیا جا رہا ہے۔ فائرنگ بھی ہو رہی ہے۔ اس خاتون کی کوشش ہے کہ بھوک سے بلکتے ہوئے بچوں کی بھوک کو کسی طرح مٹایا جائے۔ ایسے میں جب اس کا شوہر اسے بیٹے کی شہادت کی اطلاع دیتا ہے تو وہ بڑے حوصلے سے اسے سنتی ہے اور خاموش ہو جاتی ہے۔ وہ کوئی ایسا تاثر نہیں دیتی کہ جس سے اندازہ ہو سکے کہ اس نے کوئی غم کی کہانی سنی ہو۔

شام چار بجے جب کریک ڈاؤن ختم ہو جاتا ہے تو وہ اپنے شوہر سے کہتی ہے کہ آپ تھانے سے اپنے بیٹے کی لاش لے آئیں۔ لاش دیکھ کر وہ اپنے بیٹے سے' شہید بیٹے سے' یہ سوال کرتی ہے کہ بیٹا' مجھے تمھاری شہادت پر تب یقین آئے گا جب تم آنکھ اٹھا کر میری طرف دیکھو گے۔ یقین جانیے کہ وہ شہید آنکھیں کھولتا ہے' مسکراتا ہے اور پھر سو جاتا ہے--- یہ محض ایک ایمان افروز واقعہ ہی نہیں بلکہ اس جہاد کی حتمی کامیابی کی دلیل بھی ہے۔ یہ معجزات جہاد کشمیر میں رونما ہو رہے ہیں۔ اللہ کی تائید ہمارے شامل حال ہے۔ یہی خاتون اس موقع پر قسم اٹھاتی ہے اور اعلان کرتی ہے کہ وہ اپنا دوسرا بیٹا بھی جہاد کشمیر میں شہادت کے لیے پیش کرتی ہے۔ یہ ہے وہ کردار جو کشمیری خواتین جہاد کشمیر میں ادا کر رہی ہیں۔

پھر وہ وقت بھی آتا ہے جب ۱۹۹۸ میں اس کا دوسرا بیٹا شہید ہو جاتا ہے۔ اس دوران بھارتی فوج کے ہاتھوں ان کا گھرانہ بری طرح تشدد کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ اس لیے کہ انھیں معلوم تھا کہ اس عورت نے قسم اٹھا رکھی ہے کہ اس کا دوسرا بیٹا بھی جہاد کشمیر میں کام آئے گا۔ وہ اس گھرانے کو عبرت کا نشان بنا دینا چاہتے تھے۔ اس کے نتیجے میں اس گھرانے کو' اس کے خاندان کو اتنی اذیتیں دی گئیں کہ ان کے لیے کشمیر کو جہنم بنا دیا گیا۔ بھارتی فوج کے ظلم و ستم سے بچنے کے لیے انھیں کشمیر میں رہتے ہوئے مہاجرین کی طرح ہجرت کرنا پڑی۔ وہ ایک گھر سے دوسرے گھر' ایک جگہ سے دوسری جگہ چھپتے رہے۔

اکتوبر ۱۹۹۸ میں اس عورت کو یہ اطلاع ملتی ہے کہ اس کا دوسرا بیٹا بھی شہید کر دیا گیا ہے۔ بھارتی فوجی اس عورت کو پکڑ کر اس جگہ لے جاتے ہیں جہاں اس کا بیٹا شہید ہوا تھا۔ اس موقع پر بھارتی فوجیوں نے کہا کہ جب تم نے قسم دی تھی تو ہم نے بھی یہ کہا تھا کہ جب تمھارا بیٹا ہمارے ہاتھ لگے گا تو ہم اس کی وہ حالت کریں گے اور وہ حشر کریں گے کہ دنیا دیکھے گی کہ جہاد میں حصہ لینے والے اور مرنے والوں کا کیا انجام ہوتا ہے۔ اس وقت دیکھیں گے کہ تمھارا کتنا حوصلہ ہے۔

اس ماں کا حوصلہ دیکھیے کہ بیٹے کی لاش دیکھنے سے پہلے وہ ان سے پوچھتی ہے کہ مجھے بتاؤ کہ کیا اس نے مقابلہ بھی کیا؟ کیا اس نے کسی کو مارا بھی؟ بھارتی فوج کے کمانڈر نے کہا کہ ہاں' اس نے ہمارے سات فوجیوں کو مارا ہے۔ اس پر وہ کہتی ہے: الحمدللہ! پھر کوئی غم نہیں۔ اس کے بیٹے کی لاش کس حال میں ملتی ہے' حضرت حمزہؓ کی طرح! لاش ٹکڑے ٹکڑے تھی۔ وہ ان ٹکڑوں کو جمع کرتی ہے' ایک ٹوکری میں ڈالتی ہے' اس پر گھاس ڈالتی ہے' اور اس ٹوکری کو لے کر اپنے گھر کی طرف چل پڑتی ہے۔ چلتے ہوئے وہ ایک نعرہ لگاتی ہے۔ کیا نعرہ:

ہم کیا چاہتے ہیں ..... آزادی!
پاکستان سے رشتہ کیا .... لا الہ الا اللہ

کیا آپ میں حوصلہ ہے اس ذمہ داری کو ادا کرنے کا!

بھارتی جرنیل سندرجی کا کہنا ہے کہ ہم نے کشمیر میں ہر حربہ آزمایا۔ ظلم و تشدد اور جارحیت کا ہر طریقہ اپنایا' نوجوانوں کو شہید کیا' عورتوں کی عصمتیں برباد کیں' دکانوں اور بازاروں کو جلا ڈالا حتیٰ کہ ۲۰۰ بچوں کو زندہ جلا دیا' ہم نے لاشوں کے ڈھیر کے ڈھیر لگا دیے لیکن کشمیریوں میں آزادی اور جہاد کا جذبہ کچل نہیں سکے۔ وہ اپنی حکومت سے استدعا کرتا ہے کہ انھیں یہاں سے نکال لیا جائے۔ وہ جذبہ کیا ہے--- کشمیر بنے گا پاکستان!

لوگ کہتے ہیں کہ کشمیریوں کو کیا ہو گیا ہے؟ پاکستان کے لیے کیوں اپنی نسلوں کو مٹا رہے ہیں؟ کوئی اور مطالبہ کیوں نہیں کرتے؟ مگر اہل کشمیر کی نظر بھی بہت دور تک ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ایک وقت آئے گا جب پاکستان کو امت مسلمہ کی امامت و قیادت کا کردار ادا کرنا ہے۔

ہم نتائج کے ذمہ دار نہیں ہیں۔ نتائج اللہ تعالیٰ مرتب کرتا ہے۔ جہاد کشمیر کو کامیابی سے ہم کنار کرنا اللہ کا کام ہے۔ ہماری ذمہ داری تو صرف یہ ہے کہ ہمیں جہاد کے راستے میں' صرف اللہ کی رضا اور خوشنودی کی خاطر' جو کچھ ہمارے پاس ہے' اسے لٹانا اور کھپانا ہے۔ جس طرح حضرت ابوبکر صدیقؓ نے لٹایا' حضرت عمر فاروقؓ نے لٹایا یا اس صحابیؓ کی طرح جس نے رات بھر مشقت کر کے اپنی جمع پونجی اللہ کی راہ میں دے دی۔ ہمارے لیے یہی راستہ ہے۔ آج اہل کشمیر اسی راہ پر گامزن ہیں۔

میری بہنو! یہی ذمہ داری آپ کی بھی ہے۔ جہاد کشمیر میں آپ کو بھی اپنا کردار ادا کرنا ہے۔ یہ دنیا کی منفرد جنگ ہے جو کشمیری اپنے گھروں کے اندر لڑ رہے ہیں۔ ان حالات میں کہ ان کے پاس کوئی محفوظ ٹھکانہ نہیں ہے' کوئی بیس کیمپ (base camp) نہیں ہے کہ وہ لڑنے کے بعد اس میں پناہ لے سکیں۔ ان کے لیے کوئی ایسی کھلی سرحد نہیں ہے جس کے پار وہ آ جا سکیں۔ وہ بھارتی فوج میں گھرے بیٹھے ہیں' ظلم و ستم سہ رہے ہیں' ہر طرح سے قربانیاں دے رہے اور اپنے جہاد کو جاری رکھے ہوئے ہیں۔

جہاد کشمیر میں خواتین بھرپور حصہ لے رہی ہیں۔ یہ جہاد خواتین اپنے گھروں میں کر رہی ہیں۔ کشمیری نوجوان جہاد میں حصہ لینے کے لیے سرحد پار نہیں جا سکتے۔ وہ پناہ لینے' چھپنے اور تازہ دم ہونے کے لیے اپنے گھروں میں واپس اپنی ماؤں کے پاس آتے ہیں۔ وہ اپنی ماؤں سے کہتے ہیں کہ مجاہدوں کے لیے کھانا تیار کرنا ہے۔ وہ ان مجاہدوں کے لیے کھانا تیار کرتی ہیں جو بڑی تعداد میں سیکڑوں میل سے نقل مکانی کر کے جہاد کشمیر میں حصہ لینے کے لیے آتے ہیں۔ بھارتی فوجی ان مجاہدوں کی تلاش میں ہوتے ہیں' ایسے گھروں میں پہنچتے ہیں اور پوچھتے ہیں کہ اتنا زیادہ کھانا کس لیے پکایا جا رہا ہے؟ اس جرم کی پاداش میں ان پر ظلم و تشدد کیا جاتا ہے' ان کے گھروں کو جلایا جاتا ہے۔ مگر ان ماؤں کا عزم و حوصلہ ہے کہ وہ ظلم و ستم بھی سہتی ہیں' کھانا بھی پکاتی ہیں اور مجاہدوں کے ٹھکانوں پر اسے پہنچاتی بھی ہیں۔ وہ کھانے کے ساتھ ساتھ اسلحہ بھی پہنچاتی ہیں۔ یوں وہ جہاد میں عملاً حصہ لے رہی ہیں اور جراتوں اور شہادتوں کی داستانیں رقم کر رہی ہیں۔

یہ کپواڑہ کا واقعہ ہے جب ۱۹۹۰ میں پورے کپواڑہ کو آگ لگا دی گئی۔ ۲۸ خواتین کی دن دہاڑے عصمتیں تار تار کر دی گئیں۔ تین دن تک کسی اخباری نمایندے کو اور کسی فرد کو وہاں جانے کی اجازت نہیں دی گئی۔ تین دن بعد جب لوگ وہاں پہنچے تو ایک بزرگ خاتون ملی۔ وہ تن تنہا رہتی تھی۔ اس کا خاوند فوت ہو چکا تھا۔ اس کا کوئی جوان بیٹا نہ تھا۔ اس کے گھر میں مجاہدین نے اسلحہ چھپا رکھا تھا۔ اس کی حفاظت اس کی ذمہ داری تھی۔ بھارتی فوجی اس سے اس لیے نہیں پوچھتے تھے کہ وہ بوڑھی تھی' اکیلی رہتی تھی اور اس کا کوئی جوان بیٹا نہیں تھا۔ اسی لیے اس کے گھر کو اس کام کے لیے منتخب کیا گیا تھا۔

جب پورے کپواڑہ کو آگ لگا دی گئی' ۲۸ خواتین کی بے حرمتی کی گئی تو وہ رونے لگی اور چلانے لگی کہ میرا سامان اندر رہ گیا ہے۔ لوگ پوچھنے لگے کہ کیا رہ گیا ہے؟ اس نے کہا قرآن مجید' کپڑے اور دوسرا سامان اندر رہ گیا ہے۔ وہ تیزی سے اندر جاتی ہے۔ کلاشنکوفوں کو کھول کر ایک بڑے سے ٹوکرے میں ڈالتی ہے۔ ان کے اوپر گھاس ڈالتی ہے اور تیزی سے نکل کر کھیتوں میں چلی جاتی ہے۔ اس سے کوئی نہیں پوچھتا کہ وہ کیا لے جا رہی ہے؟ وہ وہاں چھپی رہتی ہے۔ تین دن بعد جب مجاہد وہاں آتے ہیں تو وہ پریشان اور شرمندہ تھے کہ اس بوڑھی عورت کا ایک آسرا اس کا گھر تھا جو جل کر راکھ ہو گیا۔ ہماری وجہ سے اسے یہ تکلیف اٹھانا پڑی۔ اب ہم اس کا سامنا کیسے کر سکیں گے۔ وہ ماں خود ان کے پاس چل کر آتی ہے اور کہتی ہے کہ بیٹا' اپنی امانت تو لے جاؤ میں تو اسی کے لیے رو رہی تھی۔ اس گھر کا کیا ہے یہ تو بن ہی جائے گا۔ یہاں نہیں بنے گا تو جنت میں تو ضرور بن جائے گا--- یہ ہے وہ جذبہ جسے بھارتی فوج نہیں مٹا سکی ہے۔

میری بہنو! جب ہم مسلمان ہیں' قرآن پر ہمارا ایمان ہے تو پھر یہ نہیں ہو سکتا کہ ہم اللہ کو بھی مانیں اور جہاد بھی نہ کریں اور اگر جہاد کریں تو دنیاوی مفادات کے لیے کریں۔ نیز قرآن کو بھی مانیں اور کلنٹن کو بھی مانیں۔ اور اس کے ساتھ ساتھ ہمارا رویہ یہ ہو کہ دین کو بھی مانیں اور دنیا کی قوتوں کو بھی مانیں۔ یہ دونوں چیزیں ساتھ ساتھ نہیں چل سکتی ہیں۔ یہ دو رنگی اور منافقت ہے۔ اسے ترک کرنا ہو گا۔

گذشتہ ۵۰ سال سے کشمیری اس جذبے کو زندہ رکھے ہوئے ہیں۔ ہم نے اپنی ذمہ داریوں کو محسوس کیا اور انھیں ادا بھی کیا۔ ہم نے اپنے بچوں کے ذہنوں میں اس بات کو بٹھایا اور راسخ کیا کہ غلامی ہمارا مقدر نہیں ہے۔ بھارت ہماری منزل نہیں ہے۔ کیا ہوا اگر وہ ایک بہت بڑا ملک ہے' وہ سائنس ٹکنالوجی میں بہت آگے ہے' اس نے کشمیریوں کو بہت زیادہ سہولتیں دے دی ہیں' مگر اس سب کے باوجود یہ ہمارا مقدر اور ہماری منزل نہیں ہے۔ ہماری منزل تکمیل پاکستان ہے۔

ہمیں اس بات کا بھی بخوبی اندازہ تھا کہ اگر پاکستان کے خلاف "واٹر بم" استعمال نہ ہو سکا تو پھر بھارت کشمیر کی بلند چوٹیوں کو بطور ہتھیار استعمال کرے گا۔ معرکہ کارگل سے آج یہ بات واضح طور پر سامنے آ چکی ہے کہ سیاچن گلیشیر اور کارگل کی چوٹیوں سے نہ صرف پاکستان بلکہ چین اور پورے ایشیا کی نگہداشت ہو

سکتی ہے۔ ہمیں اس بات کا بھی علم تھا کہ اگر ہم نے یہ چوٹیاں اور علاقے بھارت کے حوالے کر دیے یا انھیں خالی کر دیا تو پاکستان ہی نہیں بلکہ اسلامی ممالک کی پٹی اور وہ سات اسلامی ریاستیں جو روس (سابق سوویت یونین) کے ٹوٹنے کے نتیجے میں آزاد ہوئی ہیں' ان سب کی سلامتی خطرے میں پڑ جائے گی۔ اس لیے کشمیر کی چوٹیاں اور کشمیر کے دریا' پاکستان کی تکمیل اور مسلم امہ کی سلامتی کے لیے لازم و ملزوم ہیں۔ لہٰذا اس جہاد کو تکمیل تک پہنچانا ناگزیر ہے۔

یہ جہاد ابھی جاری ہے۔ یہ ایک روز پایۂ تکمیل کو ضرور پہنچے گا' ان شاء اللہ! مگر جب تک جہاد جاری ہے آپ کو اس جہاد کی کامیابی کے لیے ہر ممکن طریقے سے' مختلف محاذوں پر اس کی پشتیبانی کرنی ہے' اہل کشمیر کی مدد کرنی ہے اور ان کو عزم و حوصلہ دینا ہے تاکہ ان کی ہمتیں ٹوٹنے نہ پائیں۔ یہ آپ کی ذمہ داری ہے۔ اسے آپ کو نبھانا ہے۔

مجھے افسوس کے ساتھ یہ کہنا پڑ رہا ہے کہ گذشتہ دو ماہ سے کشمیری بہت مایوس ہیں۔ نفسیاتی طور پر انھیں شدید صدمہ ہے۔ وہ چاروں طرف سے بھارتی فوج میں گھرے ہوئے ہیں' ہر طرح کا ظلم سہ رہے ہیں۔ اب تو بھارتی فوج کا بہترین سرمایہ بوفرز توپیں اور مگ طیارے تک کشمیر میں آزمائے جا چکے ہیں۔ ان پر کیمیائی ہتھیار اور مہلک گیسیں تک استعمال کی گئی ہیں۔ ان سب چیزوں کا کشمیر کے وہ نوجوان مقابلہ کر رہے ہیں جنھوں نے باقاعدہ فوجی تربیت حاصل نہیں کی ہے۔ جو باقاعدہ فوجی نہیں ہیں وہ چند ہفتوں کی تربیت حاصل کر کے بھارت کی سات لاکھ باقاعدہ فوج کا گذشتہ دس سال سے مقابلہ کر رہے ہیں' مگر یہ مقابلہ کب تک!

سوچنے کی بات ہے کہ بھارت کی باقاعدہ فوج کا مقابلہ کرنے کے لیے اسلحہ درکار ہے' گن شپ ہیلی کاپٹر درکار ہیں' فوج کا مقابلہ کرنے کے لیے باقاعدہ فوج کی ضرورت ہے' اپنی جانوں کو بچانے کے لیے محفوظ ٹھکانا اور محفوظ سرحد کی ضرورت ہے۔ ہمیں نہ جدید ہتھیار میسر ہیں نہ کوئی کھلا راستہ یا محفوظ سرحد۔ ہمارے پاس بھارت کی فوج کے مقابلے میں باقاعدہ فوج نہیں ہے' اس لیے کہ مجاہد لڑ رہے ہیں۔

باقاعدہ جنگ لڑنے کے لیے دو چیزوں کی بہت زیادہ اہمیت ہوتی ہے۔ ایک' سپلائی لائن۔ دوسرا' کمیونی کیشن گیپ کا نہ ہونا۔ کشمیر میں مجاہدین کو دونوں سہولتیں میسر نہیں ہیں۔ بھارت جس وقت چاہتا ہے مجاہدین کا وائرلیس سسٹم جام کر دیتا ہے اور باہمی رابطہ ختم کر دیتا ہے۔

دوسرا مسئلہ سپلائی لائن کا ہے۔ ہماری کوئی سپلائی لائن نہیں ہے۔ برف پوش پہاڑیوں اور گلیشیر کو عبور کر کے مجاہدین جہاد کرنے کے لیے آتے ہیں۔ ۱۸' ۱۸ سال' ۲۲' ۲۲ سال کی عمر کے نوجوان ان برف پوش راستوں سے گزر کر اس حال میں آتے ہیں کہ ان کے ہاتھ اور پاؤں کی انگلیاں سردی سے جھڑ جاتی ہیں۔ وہ ایسے یخ بستہ پانی میں سے گزر کر آتے ہیں جس میں کوئی جان دار ایک سکینڈ کے لیے زندہ نہیں رہ سکتا'

انسان کی کیا مجال ہے۔ یہ نوجوان ہمارا سرمایہ ہیں' جو ہم اس راہ میں کھپا رہے ہیں۔ پھر کنٹرول لائن عبور کرنے کے بعد سات کلومیٹر کے علاقے میں بچھی ہوئی بارودی سرنگوں میں سے گزرنا پڑتا ہے۔ اس کے بعد کارگل کی برف پوش چوٹیوں کی پٹی ہے اور پھر بھارتی فوج ہے جس کا مقابلہ کرنے کے بعد یہ مجاہدین وادی کشمیر میں داخل ہو سکتے ہیں۔ یہ ان مشکلات کی ایک جھلک ہے جن کا مجاہدین کو سامنا ہے۔ مگر اس سب کے باوجود وہ بے جگری سے بھارتی فوج کا مقابلہ کر رہے ہیں۔

آج آپ کو اس بھارتی فوج کا خوف ہے جس کا یہ معصوم مجاہدین بے جگری سے مقابلہ کر رہے ہیں۔ اس بھارتی فوج کا' جو کشمیری خواتین سے ڈرتی ہے کہ کہیں انھوں نے اپنے کپڑوں میں کوئی بم نہ چھپا رکھا ہو۔ انھیں سات گز کا فاصلہ رکھنے کا حکم دیا جاتا ہے۔ وہ جو چھوٹے بچوں سے ڈرتے ہیں کہ کہیں انھوں نے اپنی جیبوں میں بم نہ چھپا رکھے ہوں' کیونکہ ایسے واقعات بھی ہوئے ہیں کہ ایک سات سالہ بچے نے گرنیڈ پھینک کر تین بھارتی سپاہیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ ہندو ایک بزدل قوم ہے۔ کشمیر میں بھارت کی بزدل فوج اسلحے کے بل پر اور اسلام دشمن قوتوں کی پشت پناہی کی بنا پر لڑ رہی ہے۔ ایسی بزدل اور خوف زدہ فوج سے ڈرنے کا کیا جواز ہے!

کشمیری قوم صرف اللہ کے بھروسے پر اور پاکستانی قوم کے بھروسے پر لڑ رہی ہے۔ اس لیے کہ پاکستان کی کشمیر کے ساتھ تین بنیادی کمٹ منٹس ہیں۔ ایک یہ کہ مسئلہ کشمیر میں پاکستان بھارت کے مقابلے میں ایک فریق ہے اور اقوام متحدہ کی قراردادوں کے تحت بھی پاکستان ایک فریق ہے۔ دوسرے' بین الاقوامی سطح پر پاکستان مسئلہ کشمیر پر وکیل بھی ہے۔ تیسرے' نبی کریمؐ کے امتی ہونے کے ناطے پاکستانی عوام ہمارے مسلمان بھائی ہیں۔ نبی کریمؐ کے فرمان کے مطابق آپ شہدا اور شہدا کے لواحقین کے وارث بھی ہیں۔ اس لیے ایمان کا تقاضا ہے کہ اہل پاکستان ان تین کمٹ منٹس کو پورا کریں۔ عوامی سطح پر جہاد کشمیر کا شعور پیدا کریں اور حکومتی سطح پر مؤثر دباؤ کے ذریعے حکومت کو مسئلہ کشمیر کے منصفانہ حل کے لیے مجبور کریں۔

لوگ جہاد کشمیر اور اس کی اہمیت سے کتنی آگہی رکھتے ہیں' اس کا اندازہ اس واقعے سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔ کراچی میں او آئی سی کی ایک کانفرنس میں شرکت کے موقع پر ایک وکیل صاحب نے میرے شوہر سے یہ کہا کہ "یہ سردار قیوم کو کیا ہو گیا ہے کہ آزاد کشمیر میں خواتین کی عصمتیں لٹ رہی ہیں"۔ ان دنوں مسلم کانفرنس کی آزاد جموں و کشمیر میں حکومت تھی اور سردار قیوم اس وقت وزیراعظم تھے۔ مجھے بہت حیرت ہوئی کہ جب ایک پڑھے لکھے تعلیم یافتہ فرد کو آزاد کشمیر اور مقبوضہ کشمیر کے فرق کا علم نہیں تو ایک عام پاکستانی کو اس جہاد کی اہمیت اور مقام کا کہاں صحیح اندازہ ہو گا۔

یہ ایک چھوٹا سا واقعہ ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ پاکستان نے مسئلہ کشمیر کو وہ اہمیت نہیں دی جو اس کو دی جانی چاہیے تھی۔ لوگوں پر مسئلے کی اہمیت کو اس طرح سے اجاگر نہیں کیا گیا جس طرح سے کیا جانا چاہیے

تھا۔ اس کے مقابلے میں بھارت نے اس کو جتنی اہمیت دی ہے اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ انھوں نے اپنی آیندہ نسلوں کے ذہن میں اس کی اہمیت کو اجاگر کیا ہے۔ راجستھان کے دور دراز علاقے کا ان پڑھ شخص جسے ہندی کے علاوہ کوئی زبان نہیں آتی ہے' وہ بھی اس بات کو بخوبی جانتا ہے کہ کشمیر بھارت کا اٹوٹ انگ ہے۔ ان میں قومی شعور پایا جاتا ہے۔ مگر ہم اس سے غافل ہیں۔ اب یہ آپ کی ذمہ داری ہے کہ مسئلہ کشمیر کو اہل پاکستان پر اجاگر کریں۔

بھارت کس کس محاذ پر کام کر رہا ہے' اس کا اندازہ سونیا گاندھی کے اس بیان سے بخوبی ہو سکتا ہے جس میں اس نے کہا تھا کہ اگر ہم نے پاکستان پر فوج کشی نہیں کی تو کیا ہوا' ثقافتی جنگ تو ہم جیت چکے ہیں۔ بھارتی فلموں کے ذریعے ہم نے پاکستان کے ہر گھر میں اپنا کلچر پہنچا دیا ہے۔ کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ آج پاکستان میں گھر گھر بھارتی فلمیں دیکھی جاتی ہیں۔ بھارت میں ایک فلم "بھارت کی قسم" بنائی گئی ہے۔ اس فلم میں پاکستان کے خلاف زہر بھرا ہوا ہے۔ اس سے پہلے بھی ایسی دو تین فلمیں بنائی گئی تھیں۔ مگر افسوس اس بات کا ہے کہ ان کی پہلی مارکیٹ پاکستان میں ہے۔ انھیں بہت شوق سے دیکھا جاتا ہے۔

"اعلان لاہور" کے موقع پر یہ بات بھی سامنے آئی کہ پاکستان اور بھارت کے درمیان سرحد کو ختم ہونا چاہیے۔ ہم ان سرحدوں کو نہیں مانتے ہیں۔ گو یہ ان لوگوں کا نقطۂ نظر ہے جن کی اسلامی روایات کی روشنی میں تربیت نہیں کی گئی تھی مگر یہ بات سوچنے کی ہے کہ اگر پاکستان بھارت کے ساتھ سرحد کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں تو پھر آخر جہاد کشمیر کے کیا معنی ہیں؟ ان رویوں کی بنا پر کشمیری یہ بات بھی سوچنے پر مجبور ہیں کہ کیا کشمیری کوئی حماقت تو نہیں کر رہے ہیں؟

آج کارگل سے پسپائی کے بعد کشمیر میں ایک مایوسی کی کیفیت ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر کارگل کی چوٹیاں کیوں خالی کی گئیں؟ کیا کارگل کشمیر کا حصہ نہیں ہے؟ مجاہدین' کشمیر کے اندر ہی لڑ رہے تھے۔ پاکستان زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتا تھا کہ کارگل میں مجاہدین کشمیر لڑ رہے ہیں۔ یہ ان کی اپنی جدوجہد آزادی ہے۔ اگر بھارت کے لیے ممکن ہے تو جس طرح سے بھارتی فوج سری نگر' سوپور' بارہ مولا' کپواڑہ اور کشمیر کے دوسرے علاقوں میں مجاہدین کے خلاف لڑ رہی ہے' ظلم و ستم کر رہی ہے' وہ کارگل کی چوٹیاں بھی مجاہدین سے چھین لے۔ مگر پاکستان نے ایسا جرأت مندانہ موقف نہیں اپنایا۔

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ بھارت اقوام متحدہ کی قراردادوں کی روشنی میں اصولی طور پر کشمیر میں رائے شماری کرانے کا پابند ہے۔ بھارت کو اس بات کی بھی فکر ہے۔ وہ اس کے لیے بھی کام کر رہا ہے۔ اس نے بڑی تعداد میں کشمیر میں بسنے والے ہندوؤں کو وہاں سے نکال کر بھارت میں جا کر بسایا ہوا ہے تاکہ وہ لوگ محفوظ رہیں۔ اگر کسی وجہ سے کل رائے شماری کرانا پڑ جائے تو ان کی رائے بھارت کے حق میں حاصل کی جا سکے۔ یہ اس کی منصوبہ بندی کا ایک حصہ ہے۔ دوسری طرف کشمیری مسلمانوں کو بے دردی

سے شہید کیا جا رہا ہے اور مسلمانوں کی نسل کشی کی جا رہی ہے۔ ان حالات میں اگر کل رائے شماری ہوتی ہے تو کیا وہ کشمیری ووٹ دیں گے جو شہید ہو چکے ہیں؟ کیا وہ ۱۰ ہزار کشمیری ووٹ دیں گے جو بھارت کی جیلوں میں بند ہیں جن کا خون اور گردے نکال کر بیچے جا رہے ہیں؟ کیا وہ ۱۰ ہزار کشمیری نوجوان ووٹ دیں گے جن کے بارے میں نہیں معلوم کہ وہ کہاں ہیں؟ ان کی لاشیں تک نہیں ملی ہیں؟ کیا وہ عورتیں ووٹ دیں گی جن کی عصمتیں لٹ چکی ہیں اور جو نفسیاتی مریض بن چکی ہیں؟ کیا وہ گھرانے ووٹ دیں گے جن کا ایک ہی کمانے والا تھا اور وہ شہید ہو چکا ہے۔

بھارت ایک سازش کے تحت کشمیریوں کی نسل کشی کے ذریعے آبادی کے تناسب کو بدلنا چاہتا ہے۔ کشمیری مسلمان شہید ہو رہے ہیں، جب کہ کشمیری ہندوؤں کی پوری کی پوری آبادی بھارت میں محفوظ ہے۔ کارگل میں چونکہ بودھ آبادی کی بیلٹ تھی اس لیے وہاں اس طرح سے خون خرابہ نہیں کیا گیا تاکہ ان کی آبادی محفوظ رہے۔ اگر کوئی مر رہا ہے تو مسلمان مر رہا ہے۔ اگر کوئی شہید ہو رہا ہے تو مسلمان شہید ہو رہا ہے۔ مسلمان بتدریج ختم ہو رہے ہیں۔ آیندہ دس سال بعد بھارت یہ کہے گا کہ آیئے کشمیر میں رائے شماری کرواتے ہیں مگر شاید اس وقت پاکستان کے حق میں فیصلہ کرنے والا کوئی کشمیری نہ ہو گا! اللہ اس وقت سے بچائے جب ہم تاریخ کے کٹہرے میں کھڑے ہوں گے۔

یہ آپ کی ذمہ داری ہے کہ پاکستان کی نسلوں کو ان حقائق سے آگاہ کریں۔ انھیں بتائیں کہ اگر آج کشمیری ختم ہو گئے تو پھر خدانخواستہ کل پاکستان کی باری ہو گی۔ اللہ نہ کرے کہ یہ تاریخ آپ کے ساتھ بھی دہرائی جائے۔ اس احساس اور شعور کو بیدار کرنا آپ کا کام ہے۔ یہ آپ کی ذمہ داری ہے۔ اس کی آج فکر کیجیے۔ اگر آج آپ مظلوموں کی چیخ و پکار سن رہے ہیں، کشمیریوں پر ہونے والے ظلم و ستم کو دیکھ رہے ہیں تو پھر اس ظلم کو مٹانے کے لیے آگے بڑھیے اور اپنا کردار ادا کیجیے۔ سات سالہ معصوم عائشہ جو اپنے باپ پروفیسر امین کے ساتھ اسکول جا رہی تھی، بھارتی فوجیوں نے باپ کے سامنے ریپ (rape) کیا، باپ کو بھی شہید کر دیا اور بیٹی کو بھی شہید کر دیا گیا۔ کیا وہ خون ہم سے حساب نہیں مانگے گا؟ کیا شہداے کشمیر کا خون ہم سے حساب نہیں مانگے گا؟

کارگل میں جو کچھ ہوا ہے، اس نے اہل کشمیر کو مایوس کیا ہے۔ ہم جیتی ہوئی جنگ کارگل میں ہار گئے۔ اس مایوسی کی کیفیت کو آپ نے دور کرنا ہے۔ مردوں نے اگر پسپائی دکھائی ہے، تو آپ آگے بڑھیے، اس شعور کو عام کیجیے۔ اپنی نسلوں کو تیار کیجیے۔ اس بات کا عہد کیجیے کہ ہمیں ہر حال میں کشمیر کو پاکستان کا حصہ بنانا ہے۔ اس کے لیے ہر طرح سے کوشش اور تعاون کیجیے۔ ایک مٹھی چاول دے کر، اپنی آمدنی کا ایک حصہ دے کر، چند روپے دے کر، ہتھیار دے کر، احساس کو اجاگر کر کے اور نسلوں کو تیار کر کے۔

جہاد جاری ہے۔ اپنے حوصلوں کو بلند رکھیے۔ کشمیر کی ایک کروڑ بیس لاکھ کی آبادی میں سے اگر جموں

کی آبادی کو چھوڑ دیا جائے تو ۶۰ لاکھ کشمیری گذشتہ دس سال سے لڑ رہے ہیں اور شہید ہو رہے ہیں۔ وہ ختم تو نہیں ہو گئے۔ اللہ کی مدد ہمارے شامل حال ہے۔ اللہ کے بھروسے پر کوششیں جاری رکھیے۔ ان شاء اللہ کامیابی قدم چومے گی۔

آج معرکہ کارگل میں جو کچھ ہوا وہ وہی کچھ ہے جو ۱۹۶۵ میں ہمارے ساتھ ہوا۔ جب پاکستان کی افواج پونچھ سیکٹر میں داخل ہو گئیں تو وہاں کی خواتین نے خوشی کے مارے کہ ہم آزاد ہو گئے ہیں' روٹیاں پکا پکا کر پاکستانی فوجیوں کو بھجوانا شروع کر دیں۔ مگر یہ خوشی ادھوری رہ گئی جب یہ اعلان ہوا کہ معاہدہ تاشقند کے تحت فوجیں واپس اپنی سرحدوں پر چلی جائیں گی اور علاقہ خالی کر دیا جائے گا۔ جب پونچھ بھارتی فوج کے قبضے میں واپس چلا گیا تو اس گاؤں کی ان خواتین کو ننگا کر کے ان ہی توؤں پر زندہ جلایا گیا۔ ان کی چھاتیوں کو کاٹ کر دیگچیوں میں ابالا گیا۔ پھر ان لاشوں کو دریائے جہلم میں پھینک دیا گیا کہ یہ پاکستانی فوجیوں کو مل سکیں۔ میں نے ایک فوجی سے پوچھا کہ اس موقع پر آپ کا کیا ردعمل تھا؟ اس نے جواب دیا کہ ہم نے سات دن تک ایک دوسرے سے بات نہیں کی۔ ہم اتنے شرمندہ تھے!

کیا یہ کہانی آج پھر کارگل میں نہیں دہرائی گئی؟ کیا آپ نے ہمیں اسی لیے تنہا چھوڑا ہے کہ مسلمان خواتین کو بے آسرا کر کے بھارت کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا جائے۔ کیا تاریخ اس کو معاف کر دے گی؟ کیا آپ سے اس کے بارے میں کوئی پوچھ گچھ نہیں ہو گی کہ وہ قوم جو صرف آپ کی آزادی اور سلامتی کے تحفظ کے لیے لڑ رہی ہے' اسے بے بسی میں ظلم و ستم سہنے کے لیے تنہا چھوڑ دیا گیا؟ کیا آپ اہل کشمیر کو تنہا چھوڑ سکتے ہیں؟ کشمیر تو آپ کے لیے بھی زندگی اور موت کی حیثیت رکھتا ہے۔ آپ کیوں نہیں سمجھتے!

میری بہنو! یہ وہ ذمہ داریاں ہیں جو آپ کو ادا کرنی ہیں۔ جہاد کشمیر کسی سیاسی جماعت کا کوئی نعرہ نہیں ہے بلکہ یہ پاکستان کا قومی مسئلہ ہے۔ اسے سیاست سے' سیاسی وابستگیوں سے بالاتر ہو کر لے کر چلنا ہے۔ اس کے لیے ہر فرد تک پہنچنا ہے' ہر فرد کو ساتھ لے کر چلنا ہے۔ اس لیے کہ یہ پوری قوم کی زندگی اور موت کا مسئلہ ہے۔ آپ ہی نے اہل کشمیر کو امید کا پیغام دینا ہے' ان کے عزائم کو حوصلہ دینا ہے' ان کی امید کو قائم رکھنا ہے' اور ان کی رگوں میں دوڑتے ہوئے خون کو رواں دواں رکھنا ہے۔ یہ آپ کی ذمہ داری ہے' اسے آپ کو نبھانا ہے۔ یہی کشمیر کی پکار ہے۔

آگے بڑھیے فرض آپ کو پکار رہا ہے!

(خطاب تربیت گاہ' تنظیم اساتذہ پاکستان (خواتین)' ۴/اگست ۱۹۹۹' تنظیم منزل' لاہور)۔

منشورات پیش کرتا ہے

خرم مراد کی تحریریں

رہنمائی

رسائل و مسائل کے عنوان سے شائع ہونے والے سوالات و جوابات

صفحات: ۲۱۲ قیمت: ۶۰ روپے

تحریک اسلامی

اہداف' مسائل' حل

۱۷ مقالات کا مجموعہ

تحریک کے مختلف مراحل پر رہنمائی کے لیے لکھے گئے اشارات
آج بھی راستہ دکھاتے ہیں

صفحات: ۳۲۰ قیمت: ۸۰ روپے

اپنی نماز درست کریں

محمد انور علوی

نوجوانوں اور بوڑھوں کے لیے
یکساں ضروری

صفحات: ۸۰ قیمت: ۱۵ روپے

سید قطب شہیدؒ : حیات و خدمات

عبیداللہ فہد فلاحی۔ سید صلاح الدین عمری

اس صدی کی ایک اہم شخصیت پر ایک
غیر معمولی تحقیقی ایمان افروز کاوش

صفحات: ۴۰۰ قیمت: ۱۲۰ روپے

ہیڈ آفس: منشورات' منصورہ' ملتان روڈ' لاہور - 54570 فون: 5425356 فیکس: 7832194 (042)

کراچی: ڈیسنٹ بک پوائنٹ' A/57 بلاک 5 'گلشن اقبال - 75300 فون: 4967661

پنجاب: ماس میڈیا نیٹ ورک' 10- صابر سٹریٹ' ذیلدار پارک' اچھرہ' لاہور 54600 فون: 7585590

اخبار امت

مشرقی تیمور کی آزادی

محمد ایوب منیر

تقسیم کے بعد آگ اور خون کی وہ ہولی جو مسلم اقلیت کے علاقوں میں کھیلی گئی تھی وہی کہانی آج مشرقی تیمور میں دہرائی جا رہی ہے لیکن اس آگ کو بھڑکتے رکھنے میں لندن' نیویارک' ہانگ کانگ اور دیگر اعصابی مراکز سے شائع ہونے والے رسائل و جرائد کا بھی بڑا کردار ہے جو انڈونیشیا کو اپنے ہی عیسائی صوبے کے الحاق کی ایسی کڑی سزا دینا چاہتے ہیں کہ آیندہ دنیا بھر کے مسلمانوں کو کان ہو جائیں۔ مشرقی تیمور کی آزادی اہل تیمور کے ساتھ ساتھ صدر امریکہ' عیسائی کلیسا اور ذرائع ابلاغ کے جان دار پراپیگنڈے سے ممکن ہوئی ہے۔

سہارتو کے رخصت ہوتے ہی مشرقی تیمور کی آزادی کا مسئلہ عالمی ذرائع ابلاغ کا موضوع بن گیا۔ صدر حبیبی کو ریفرنڈم کا مطالبہ تسلیم کرنا پڑا اور انڈونیشیا کے عام انتخابات کے بعد ۳۰/اگست کی تاریخ اس کے لیے طے ہو گئی لیکن ریفرنڈم کے بعد تشدد نے اہل انڈونیشیا کو لرزا کر رکھ دیا ہے۔ اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ مشرقی تیمور کو ایک روز الگ ہونا ہی تھا لیکن عالمی ذرائع ابلاغ انڈونیشیا کو اور اس کی افواج کو بدنام کرنے کے لیے حقائق کو مسخ کر رہے ہیں۔

صدر حبیبی عالمی فوج کی تعیناتی پر کس طرح رضامند ہوئے؟ نیوز ویک کے نمایندے جیفرے بارتھولٹ نے ۲۰ ستمبر کی اشاعت میں تحریر کیا: اقتصادی پابندیوں کی دھمکی سے ہی انڈونیشیا کو عالمی فوج کی تعیناتی کے لیے رضامند کیا جا سکتا تھا۔ نیوزی لینڈ میں ہونے والی ایشیائی اقتصادی کانفرنس میں شرکت سے قبل ہی صدر کلنٹن نے انڈونیشیا سے اقتصادی مراسم توڑنے کا فیصلہ کر لیا' انھوں نے عندیہ دیا کہ ہماری بات مانے بغیر اقتصادی امداد کی اگلی قسط جاری نہ کی جائے گی۔

آئی ایم ایف کے ڈپٹی مینجنگ ڈائرکٹر سٹینلے فیشر نے کہا کہ مشرقی تیمور کے حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے انڈونیشیا پر رقم لٹانا ہمارے بس میں نہیں ہے۔ اقوام متحدہ کے کمپاؤنڈ پر حملہ ہوا تو صدر کلنٹن نے

چار کروڑ ڈالر کی فوجی سازوسامان کی فراہمی پر پابندی عائد کر دی۔ آسٹریلیا مشرقی تیمور کے اندر ۲ ہزار ۵ سو فوجی قیام امن کے لیے بھیجنے پر تیار تھا۔ ۱۳ ستمبر کو انڈونیشیا کی افواج کے سربراہ جنرل ورانٹو نے جب اعلان کیا کہ امن فوج کی تجویز پر غور کیا جا سکتا ہے تو اس بیان کے چند گھنٹے کے بعد صدر بل کلنٹن نے آک لینڈ میں کہا: چند دن کی محنت سے بہت بڑی کامیابی ملی ہے۔ محسوس ہوتا ہے کلنٹن پھر کامیاب ہو گیا ہے (نیوز ویک' ۲۰ ستمبر ۱۹۹۹)۔

عالمی برادری کن خطوط پر سوچ رہی تھی' اکانومسٹ کا اداریہ نویس تحریر کرتا ہے: سفارت کاری کافی نہیں ہے۔ اقوام متحدہ یعنی سلامتی کونسل کو چاہیے کہ وہ انڈونیشیا کو دھمکائے' اور انڈونیشیا کی رضامندی کے خلاف وہاں فوج استعمال کرے۔ ریفرنڈم کے لیے رضامندی ظاہر کرتے ہوئے حبیبی کا خیال تھا کہ شاید ووٹ انڈونیشیا کے حق میں ہوں گے۔ آیندہ حبیبی اور فوج کا کوئی جرنیل ایسی غلطی کرنے کا سوچے گا بھی نہیں۔ دنیا کو چاہیے کہ وہ انڈونیشیا کے ذہن سے یہ خیال نکال دے کہ وہ اب مشرقی تیمور پر مزید حکمرانی کر سکے گا (اکانومسٹ ' ۱۱ ستمبر ۹۹)۔

تیمور کی نیشنل کونسل برائے مزاحمت کے سربراہ نے ٹھیک کہا: یہ فتح بین الاقوامی سیاست کے میدان کی فتح ہے۔ (ایشیا ویک ' ۱۰ ستمبر ۹۹)۔

انڈونیشی حکومت نے کیوں یہ فیصلہ کیا' اسے سمجھنے کے لیے مشرقی تیمور کا تاریخی پس منظر دیکھنا ہو گا۔

مشرقی تیمور انڈونیشیا کے ہزاروں جزائر میں سے ایک جزیرہ ہے جو پہاڑی علاقے پر مشتمل اور قدرتی وسائل سے مالا مال ہے۔ یہ جکارتا سے ۲۵۰۰ کلومیٹر کے فاصلے پر مشرق میں واقع ہے۔ اس کے دارالحکومت دلی (Dilli) کا رقبہ ۱۴ ہزار ۶ سو ۱۵ مربع کلومیٹر اور آبادی سوا آٹھ لاکھ ہے۔ غالب اکثریت عیسائی مذہب کی پیروکار ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ عالم عیسائیت کی پشت پناہی کی بدولت ہی مشرقی تیمور کو آزادی نصیب ہو سکی ہے۔

ماضی میں ملایا اور جزائر شرق الہند کا تذکرہ ساتھ ساتھ ملتا ہے۔ ملایا دور جدید میں انڈونیشیا اور ملائشیا جیسی مسلم ریاستوں میں تبدیل ہو چکا ہے جب کہ جزائر شرق الہند تیمور کے نام سے مشہور ہوا۔ نوآبادیاتی دور میں جب ہندستان' مصر' سوڈان اور افریقی ممالک کو غلامی کی زنجیروں میں جکڑا گیا تو ہالینڈ نے ان سینکڑوں جزائر پر قبضہ کر لیا جو آج انڈونیشیا کی ریاست کا حصہ ہیں۔ جزیرہ تیمور کے مغربی حصے پر ہالینڈ ہی کا قبضہ رہا لیکن مشرقی تیمور پرتگال کے زیرنگیں آیا اور پرتگال نے چار سو سال تک گندم' چاول' ناریل' صندل' قہوہ' تیل' گیس اور قدرتی وسائل سے مالا مال اس علاقے پر حکومت کی' اور استحصال کیا۔ انڈونیشیا کے آزاد اسلامی مملکت بن جانے کے باوجود مشرقی تیمور پر پرتگال کا پرچم لہراتا رہا۔

۱۹۷۴ میں پرتگال کے اندر سیاسی تبدیلیاں رونما ہوئیں تو ستمبر ۱۹۷۵ میں اس علاقے کی آزادی کا اعلان کر دیا گیا اور پرتگال نے یہاں سے اپنی فوجیں نکال لیں۔ چونکہ پرتگال نے انڈونیشیا سے یہ علاقہ حاصل کیا تھا اس لیے صدر سہارتو نے یہاں افواج داخل کر دیں (۵ ستمبر ۱۹۷۵)۔ اس وقت بھی وہاں ۱۵ ہزار انڈونیشی فوجی موجود ہیں اور گذشتہ چوتھائی صدی سے وہاں قتل و غارت کا سلسلہ جاری ہے۔

انڈونیشیا کی حکومت اگر مشرقی اور مغربی صوبہ کو انتظامی طور پر ایک صوبہ بنا دیتی تو شاید اتنے چھوٹے سے رقبے کی ریاست وجود میں نہ آتی لیکن اس وقت حکومت نے مغربی تیمور اور مشرقی تیمور کو الگ الگ انتظامی صوبوں میں تقسیم کر دیا۔ مغربی تیمور کے مسلمان اور مشرقی تیمور کے عیسائی ایک صوبے میں رہے ہوتے تو آپس میں میل جول میں اضافہ ہوا ہوتا اور وہ صورت دیکھنے میں نہ آتی جو نظر آ رہی ہے۔ انسانی حقوق کی خلاف ورزی' خواتین سے بدسلوکی اور دیگر واقعات نے صورت حال کو اور بگاڑ دیا۔ فرٹیلین تحریک نے انڈونیشیا کی حکومت کے الحاق کو تسلیم نہ کیا۔ جلد ہی مزاحمتی تحریک کا آغاز کر دیا۔ مغربی ممالک کی امداد کے بغیر یہ تحریک اپنے منطقی انجام تک نہ پہنچ سکتی تھی۔ امریکہ' آسٹریلیا سمیت عیسائیت کے پیروکار کئی ممالک نے ۲۵ سال تک اس مسئلے کو نہ صرف اقوام متحدہ کے ایوانوں میں زندہ رکھا بلکہ اقتصادی و سیاسی دباؤ ڈالنے کے تمام حربے بھی استعمال کیے۔ صدر سہارتو کے خاندان نے جب ملک کو دیوالیہ کر کے رکھ دیا تو آئی ایم ایف نے گذشتہ سال ۴۳ ارب ڈالر کی قسط منظور ہی اس لیے کی تھی کہ مشرقی تیمور کو اپنی منزل تک پہنچانے میں کوئی رکاوٹ باقی نہ رہے اور حکومت جکارتا قرضوں میں اس قدر جکڑ جائے کہ اس کے لیے حکم عدولی ناممکن ہو جائے۔ ایسا ہی ہوا۔

مشرقی تیمور کی آزادی' اس کے بعد قتل و غارت' مارشل لا کے نفاذ اور اقوام متحدہ کی افواج کی تعیناتی کے تمام مراحل کے دوران عالمی ذرائع ابلاغ کا کردار انتہائی جانب دارانہ رہا۔ سب سے غلط منظرکشی یہ کی گئی کہ اس علاقے میں دو لاکھ باشندے مار دیے گئے' حالانکہ حقیقی صورت حال یہ ہے کہ انڈونیشیا کے فوجی دستوں نے جنگجو گوریلوں کو اپنا نشانہ ضرور بنایا لیکن بہت بڑی تعداد عیسائی حریت پسند کمانڈوز کی گولیوں کا شکار ہوئی۔ بیماریوں اور قحط سے ہلاک ہونے والے بھی اس میں شامل ہیں۔ مسلح متصادم مزاحمتی گروپوں کی لڑائیوں سے پچھلے ۲۵ سالوں میں جو لوگ ہلاک ہوئے اس میں ان کی تعداد بھی شامل ہے' لیکن سی این این' بی بی سی اور اے بی سی نے اپنی نشریات کے ذریعے یہ تاثر دینے کی مسلسل کوشش کی کہ گویا یہ تمام لوگ چند ماہ میں انڈونیشیا کی افواج کی گولیوں کا شکار ہوئے ہیں۔

حکومت انڈونیشیا نے عیسائی آبادی کی ہمدردیاں حاصل کرنے کے لیے صوبے کے اندر تعلیمی اداروں اور سڑکوں کا جال بچھایا۔ بجٹ کا نمایاں حصہ مشرقی تیمور کے لیے مخصوص کیا۔ ۱۹۹۶ میں عیسائی نمایندہ لیڈروں نے

مذاکرات کیے اور ان کو وسیع تر خود مختاری کی جانب راغب کرنے کی کوشش کی، لیکن عالمی طاقتیں یہ چاہتی تھیں کہ مشرقی تیمور آزاد ریاست بن کر رہے۔ اس لیے جکارتا کی تمام سفارتی کوششیں ناکام رہیں۔

مشرقی تیمور کا ریفرنڈم اقوام متحدہ میں پاکستانی سفارت کار جمشید مارکر (مذہباً عیسائی) کی زیر نگرانی ہوا۔ کوفی عنان نے ۴ ستمبر ۱۹۹۹ کو نیویارک میں سلامتی کونسل میں ریفرنڈم کے نتائج کا اعلان کیا۔ نتائج کے مطابق ساڑھے چار لاکھ کے قریب افراد نے اپنے حق کا استعمال کیا، ۷۸.۵ فی صد نے آزادی کے حق میں جب کہ ۲۱ فی صد نے انڈونیشیا کے اندر خود مختاری کے حق میں رائے دی۔ کوفی عنان نے اعلان کیا کہ اقتدار کی منتقلی تک علاقہ انڈونیشیا کے زیر نگیں رہے گا۔ لیکن ۷ ستمبر سے مشرقی تیمور کے دارالحکومت دلی اور اس کے ارد گرد کے علاقوں میں فسادات پھوٹ پڑے جو بین الاقوامی امن فوج بھیجنے پر منتج ہوئے۔

مشرقی تیمور کی آزادی کے اثرات نومبر میں ہونے والے انڈونیشیا کے صدارتی انتخابات پر لازماً پڑیں گے۔ میگاوتی سب سے بڑی پارٹی (۱۵۵ نشستیں) کی امیدوار ہیں۔ دوسرے نمبر پر گولکار پارٹی کے موجودہ صدر حبیبی (۱۲۰ نشستیں) ہیں۔ یہ سہارتو کا تسلسل اور فوج کے نمائندہ کہے جاسکتے ہیں۔ ان کے امکانات اب کم ہو گئے ہیں۔ رسالہ ٹائم کے مطابق: "صدر حبیبی نے ایک ہی ہفتے میں مشرقی تیمور، عالمی حمایت اور ملک پر کنٹرول سب کچھ کھو دیا (۲۰ ستمبر ۱۹۹۹)۔ (تیسرے نمبر پر عبدالرحمٰن واحد کی پارٹی (۳۵ نشستیں) اور امین رئیس کی پارٹی (۳۰ نشستیں) ہیں۔ پانچ سو کے ایوان میں ابھی ۳۵ نشستیں فوج کو نامزد کرنا ہے اور مزید ۱۳۵ صوبائی اسمبلیوں سے آنا ہیں جہاں گولکار کے اچھے اثرات ہیں۔ دونوں اسلامی پارٹیاں مل کر شاید کوئی فیصلہ کن اثر ڈال سکیں۔ امکان ہے کہ یہ میگاوتی کی حمایت کریں گی)۔

مشرقی تیمور میں ریفرنڈم جن حالات میں ہوا اور بعد میں جو کچھ ہوا، اس سے قطع نظر یہ اس امر کی مثال ہے کہ کسی علاقے کے لوگوں کی مرضی معلوم کر کے، اس کے مستقبل کا فیصلہ کیا جائے۔ کشمیر اور اس کی مماثلت تلاش کی گئی تو امریکہ کے محکمہ خارجہ نے دونوں کو الگ الگ مسئلہ قرار دیا۔ حالانکہ بنیادی مسئلہ یہی ہے کہ اہل کشمیر سے ان کی مرضی معلوم کی جائے اور ان کو حق خود ارادیت دیا جائے۔ اقوام متحدہ خود اپنی قراردادوں پر عمل کروانے سے پیچھے ہٹ گئی ہے اس لیے کہ عالمی ٹھیکے داروں کے مفادات اس سے پورے نہیں ہوتے۔ اہل کشمیر کی بدنصیبی یہ ہے کہ انھیں جو وکیل ملے ہیں، انھوں نے اپنی قسمت امریکہ سے وابستہ کر رکھی ہے۔ وہ یہ نہیں سوچتے کہ اگر مشرقی تیمور سے انڈونیشی افواج کا انخلا ہو سکتا ہے تو کشمیر سے بھارتی افواج کا انخلا کیوں نہیں ہو سکتا۔ کیا اس لیے کہ اہل کشمیر مسلمان ہیں؟ کشمیریوں کو، اور ان کے پشتیبانوں کو اور حکومت پاکستان کو بھی عالمی ضمیر کو جھنجھوڑنے اور بھارت پر دباؤ کو آخری حد تک پہنچانے کے لیے زیادہ منظم ہو کر کام کرنے کی ضرورت ہے۔

جہاد کی مشعل فروزاں: داغستان

مسلم سجاد

جہاد افغانستان نے اطراف و اکناف عالم میں جہاد کی جو شمعیں روشن کی ہیں' ان میں تازہ ترین داغستان کا محاذ ہے جہاں چند سو مجاہدین نے لٹے ہوئے سوا لاکھ کے ہاتھی روس کو دو مہینے میں ہی ناکوں چنے چبوا دیے ہیں اور روس کو اس کی حقیقی سرحدوں کی طرف واپس دھکیلنے کا عمل تیز کر دیا ہے۔

۱/۲ اگست ۱۹۹۹ کو پہلی چھاپہ مار کارروائی کے بعد ہی سے داغستان عالمی ذرائع ابلاغ کی توجہ کا مرکز بن گیا۔ پڑوسی چیچنیا (جسے اشکیریا کا نام دیا گیا ہے' قدیم نام شیشان بھی لکھا جا رہا ہے) کے حوالے دیے جانے لگے ہیں جہاں تین سال کی شدید جنگ کے بعد ۱۹۹۶ میں روس کو ذلت آمیز شکست سے دوچار ہونا پڑا تھا۔ اعلان تو یہی کیے گئے کہ دو ہفتوں میں "بغاوت" فرو کر دیں گے' لیکن وسط ستمبر تک عالم یہ ہے کہ ماسکو اور پیٹرز برگ میں بھی سلامتی کی صورت حال پیدا ہو گئی ہے۔ پاکستان اور عربوں پر الزام لگائے جا رہے ہیں۔ امریکہ اور اسرائیل کی خفیہ ایجنسیاں روس کی مدد پر کمربستہ ہیں تاکہ مجاہدین کی سپلائی اور رابطوں کا پتا چلائیں۔ روسی صدر یلسن کے حواس مزید جواب دے گئے ہیں اور انھوں نے چرنومیئڈن' کرینکوف اور ریماکوف کے بعد اب سیٹپے پوشن کو بھی برطرف کر کے' روسی خفیہ ایجنسی کے سابق سربراہ پوٹین کو نیا وزیراعظم (اور اپنی دانست میں مستقبل کا صدر) مقرر کر دیا ہے۔ سیٹپے پوشن کا قصور ان کا یہ اعتراف تھا کہ روس چیچنیا کی طرح داغستان کو بھی کھو چکا ہے۔

داغستان' بحیرہ قزوین (caspian) (جس کی تہ میں موجود تیل کے بیش بہا ذخائر پر عالمی طاقتوں کی للچائی ہوئی نظریں لگی ہوئی ہیں) کے کنارے ۲۵ لاکھ آبادی کی روسی فیڈریشن کی ایک ریاست ہے۔ اس کے ایک طرف چیچنیا ہے' مغرب میں روس اور جنوب میں آذربائیجان اور جارجیا ہیں۔ قفقاز اور اورال کے دامن کوہ کے اس خوب صورت پہاڑی علاقے میں اس کے علاوہ انگوشیا' کاباریکر' کرچا' شرکس' ابخازیا' تاتارستان' باشکیرستان اور دوسری آٹھ اسلامی ریاستیں روسی فیڈریشن کے زیر تسلط ہیں۔ روسی قیادت اور اس کے مغربی حلیفوں کی نیندیں دراصل اسی خطرے سے اڑی ہوئی ہیں کہ چیچنیا سے آزادی کی جو لہر اٹھی ہے وہ سارے قفقاز میں پھیل کر روس کو ماسکو کے اردگرد کی حقیقی سرحدوں تک نہ پہنچا دے۔ روس کے اپنے ذرائع کے مطابق وسط ایشیا کے ۱۵ کروڑ مسلمانوں میں سے تقریباً ۲ کروڑ روس کے جنوب میں ان دو علاقوں میں آباد ہیں۔ صرف تاتارستان اور باشکیرستان کی آبادی ۸۰ لاکھ ہے' دیگر ریاستیں چھوٹی چھوٹی ہیں

(تاتاریوں پر وحشیانہ روسی مظام تاریخ کا ایک دردناک باب ہیں)۔

روس اور اس کے حلیف مغربی ممالک کی تشویش کی ایک وجہ آذربائیجان میں باکو سے نکلنے والی تیل اور گیس کی بڑی پائپ لائنیں ہیں جو چیچنیا اور داغستان سے گزرتی ہیں اور بحیرہ اسود سے گزر کر یورپ پہنچتی ہیں۔ داغستان خود بھی قدرتی وسائل سے مالا مال ہے۔ امید ہے کہ اگلے عشرے تک بحیرہ کیسپین سے نکلنے والا تیل جارجیا اور ترکی کے راستے بحیرہ روم اور جنوب ایران کے راستے خلیج فارس تک جائے گا۔ اس علاقے میں اسلامی جمہوریہ اور مجاہدین کا غلبہ روس ہی نہیں، مغرب کے لیے بھی ڈراؤنا خواب ہے۔

داغستان میں ۴۰ کے قریب قومیتیں ہیں لیکن ان کی قدر مشترک اسلام ہے۔ مغربی ذرائع ابلاغ انھیں وہابی کہہ رہے ہیں۔ یہ مسلک کے لحاظ سے شافعی ہیں۔ یہ جرأت مند اور بہادر مسلمان گذشتہ دو سو سال سے جہاد کی تابندہ روایت کے امین ہیں۔ امام منصور اور شامل افسانوی شہرت رکھتے ہیں جنھوں نے روس کی استعماری کوششوں کو طویل عرصے تک ناکام بنائے رکھا۔ اشتراکی دور میں ان پر ظلم و جبر کے پہاڑ توڑے گئے۔ جہاد افغانستان کی کامیابی کے بعد روس کی گرفت ڈھیلی ہوئی تو یہاں آزادی کی تحریکیں پھر شروع ہوئیں۔ چیچنیا نے ۱۹۹۴ سے ۱۹۹۶ تک ۳ سال کی خوں ریز جنگ کے بعد عملاً روس کی غلامی سے آزادی حاصل کرلی ہے۔ یہ جہاد جعفر دادایف شہید اور شامل باسایف کی قیادت میں لڑا گیا۔

شامل باسایف نے روسی ہسپتال پر قبضے سے شہرت حاصل کی اور پھر گروزنی (جس کا نام اب جوہر گالہ ہے) میں روسی محاصرے کو ناکام بنا کر اپنا نام تاریخ میں درج کروالیا۔ اب یہ داغستان کے جہاد کی قیادت کے لیے میدان میں آگئے ہیں۔ چیچنیا کی اسلامی جمہوریہ چاروں طرف خشکی سے گھری ہوئی ہے۔ داغستان کے ساتھ اتحاد کے ذریعے ایک مستحکم اسلامی جمہوریہ وجود میں آسکتی ہے۔ داغستان کی موجودہ ماسکو نواز حکومت زیادہ دن قائم نہیں رہ سکے گی۔

اس وقت صرف ۳ ہزار مجاہدین ۶۰ ہزار سے زائد روسی فوج کے خلاف صف آرا ہیں۔ ابھی تک کی خبروں کے مطابق مجاہدین اپنے اہداف کامیابی سے حاصل کر رہے ہیں۔ روسی فوج کا مورال پہلے ہی گرا ہوا ہے۔ مزید ناکامیوں کے بعد ایک دوسرے پر ذمہ داری ڈالی جا رہی ہے۔ روسی فوج مجاہدین کے خلاف مگ-۲۹ اور مگ-۳۱ کے علاوہ گن شپ ہیلی کاپٹر اور میزائل سب کچھ استعمال کر رہی ہے۔ شہری آبادی کو نشانہ بنا رہی ہے۔ دیہاتوں پر بمباری کر رہی ہے۔ مکانات جلا رہی ہے۔ مجاہدین کے مطابق وہ چار جیٹ طیارے اور آٹھ گن شپ ہیلی کاپٹر تباہ کر چکے ہیں۔ پہلے دو ہفتوں میں ہی دو سو سے زائد روسی فوجی ہلاک ہو چکے ہیں۔ مبصرین کا یہی اندازہ ہے کہ یہ ایک طویل جنگ ثابت ہو گی۔ روس کے لیے اس پر قابو پانا

آسان نہیں ہے۔ نئے وزیراعظم کے مطابق: باغیوں کو شکست دے دی گئی تب بھی داغستان ایک زخم بنا رہے گا۔

داغستان کی صورت حال میں ہم اہل پاکستان اور امت مسلمہ کے سوچنے کے لیے بہت کچھ ہے۔

کچھ اہل دانش یہ کہتے ہیں کہ سرد جنگ کے بعد جو عالمی سیاسی صورت حال ہے، اس میں اقلیت میں موجود مسلمانوں کو آزادی کے لیے کوشش کرنے کے بجائے مقتدر طاقتوں کے ساتھ مفاہمت کی راہ تلاش کرنی چاہیے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ جذبہ اور جوش اپنی جگہ، لیکن اگر اقتصادی اور سیاسی وجوہ سے کوئی ریاست اپنے پاؤں پر کھڑی نہیں رہ سکتی تو دوسری طاقتوں کے ساتھ مل کر رہنے کی صورت نکالنا چاہیے۔ اور آخری بات یہ کہ جہاد میں کامیابی کے بعد مسلمانوں کے آپس کے جھگڑے انھیں جہاد کے ثمرات سے محروم کر دیتے ہیں، جس کی ایک مثال افغانستان ہے۔

اس استدلال کو پیش کرنے والے اس کیفیت کو کیا جانیں جس میں گذشتہ کئی سو سال سے داغستان اور اس سے ملحقہ علاقوں کے جرأت مند مسلمان اپنی آزادی کے لیے قربانیاں دیتے رہے ہیں۔ اس طرح سے تو کبھی کہیں آزادی کی تحریک شروع ہی نہ ہو اور کبھی کوئی کمزور گروہ طاقتور پر غالب نہ آئے اور ظلم کا کبھی مداوا نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ اپنی اس دنیا میں قوموں کو الٹتا پلٹتا رہتا ہے۔ مسلمانوں کے لیے تو یہی راستہ ہے کہ وہ اپنے ایمان اور دین کے تقاضے پورے کریں اور کفر کے غلبے پر ہرگز راضی نہ ہوں۔ اگر جدوجہد اور کش مکش نہ ہو تو قرآن کے کتنے ہی حصے اپنے معنی کھو دیتے ہیں۔ جب مکہ میں اللہ کے رسولؐ نے دعوت کا آغاز کیا تو کیا حالات، مدینے میں اسلامی ریاست کے لیے سازگار تھے؟ مسلمانوں کی تاریخ شاہد ہے کہ جب بھی انھوں نے اللہ کی راہ میں جہاد کیا ہے، اللہ نے ان کے لیے راستے کھولے ہیں، حالات کو سازگار بنایا ہے اور انھیں عزت اور سربلندی عطا کی ہے۔ ہر طرح کے وسائل، مواقع اور امکانات کے باوجود آج مسلمان اسی لیے اپنی قسمت کے مالک نہیں ہیں کہ انھوں نے اللہ پر ایمان اور جہاد کا راستہ ترک کر دیا ہے۔ آج جو طاقتیں سیاسی اور فوجی قوت کی معراج پر ہیں وہ اندر سے کھوکھلی اور اللہ کے پیغام کی پیاسی ہیں جو ان کی زندگیوں کو چین اور سکون عطا کر سکتا ہے۔ جہاد کا اصل مقصد بالآخر ان سب تک یہ دعوت پہنچانا ہے۔

داغستان کے مجاہدین کا پیغام امت مسلمہ کے لیے یہ ہے کہ وہ اپنے فرض کو پہچانے، بیدار ہو اور اپنے منصب و مقام کا شعور حاصل کرے۔ جہادی تحریکات امت کو بیدار اور متحد کر دیں اور امت اپنی اصل طاقت میں واضح ہو کر سامنے آجائے تو ہمارے دشمن ہمیں خوان یغما سمجھنا چھوڑ دیں اور بوسنیا، کوسووا اور اراکان جیسے واقعات پیش نہ آئیں۔ زندگی اور سربلندی کا راستہ یہی ہے کہ جہاد کا یہ پیغام گھر گھر

پہنچے۔ آج جعفر دودائیف اور شامل باسائیف اور دوسرے عظیم مجاہدین پر فلمیں بننا چاہییں' ڈرامے لکھے جانے چاہییں۔ یہ ہر مسلمان گھرانے کے ہیرو ہونے چاہییں اور ماؤں کو اپنے بچوں کو ان کی کہانیاں سنانی چاہییں۔ ذرائع ابلاغ' اہل دانش اور اہل قلم کا اصل فریضہ آج یہی ہے۔ جب رسل و رسائل کے جدید ذرائع نہ تھے' تب یہ امت کسی ایک عضو کی تکلیف کو ہر جگہ محسوس کرتی تھی۔ اب تو مجاہدین داغستان کی ویب سائٹ کا پیغام ہر گھر پہنچ سکتا ہے اور ان کو مدد پہنچانے کی تدابیر کی جا سکتی ہیں۔

ایک لمحے کے لیے سوچیں کہ ہم اہل پاکستان کو چیچنیا اور داغستان کے مجاہدوں کے ایمان کا دسواں حصہ بھی نصیب ہو جائے تو کیا کشمیر بھارت کے چنگل میں رہ سکتا ہے؟ یہ ہم پر کیا وقت آیا ہے کہ ہم لاکھوں کی فوج رکھنے کے باوجود مشرکین کی گیدڑ بھبکیوں سے مرعوب ہو گئے۔ کیا موت کے خوف اور دنیا کے لالچ کے امراض نے ہم کو بالکل ہی چاٹ لیا ہے؟ معاشی ترقی اور خوش حالی کے بت کو پوجنے کے بجائے اگر ملک کی پالیسی تقویٰ اور ایمان کا حصول ہو تو زمین کے خزانے اور آسمان کی برکتیں بھی ملیں گی' عزت بھی' اور آخرت کی فلاح بھی۔ یہ خدا کا وعدہ ہے اور اس کا وعدہ سچا ہوتا ہے۔

رسائل و مسائل

چہرے کے بال نوچنا

سوال: اسلام کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ ایک فطری دین ہے' انسانی فطرت کو ہمیشہ مدنظر رکھتا ہے۔ ظاہر ہے جس خدا نے انسان کو تخلیق کیا ہے وہی اس کی فطرت کو بہتر جاننے والا ہے۔ پھر یہ کیا وجہ ہے کہ ایک طرف فطرت کی اتنی اہمیت اور دوسری طرف فطرت کے اتنا خلاف۔ مثال کے طور پر عورت کی فطرت میں یہ شامل ہے کہ وہ اپنے آپ کو سنوارتی ہے اور اپنی خوب صورتی کو اجاگر کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ چہرے کے بال نکالنا بھی اپنے آپ کو سنوارنے کا ایک حصہ ہے (جو کہ آج کل بہت دیکھنے میں آتا ہے)۔ پھر کیا وجہ ہے کہ عورت کو چہرے کے بال نکالنے سے منع فرمایا گیا ہے؟ صحیح بخاری میں تو یہاں تک ہے کہ اس عورت پہ لعنت بھیجی گئی ہے جو اپنے چہرے کے بال نوچتی ہے؟ نیز یہ کہ اگر چہرے کے بال نوچنا ممنوع ہے تو کیا بازوؤں اور ٹانگوں کی "waxing" کی اجازت ہے؟ کیا چہرے کے وہ بال بھی نکالنا ممنوع ہیں جن سے مرد کی شباہت ہوتی ہے' مثلاً کچھ عورتوں کی بھنویں گھنی ہوتی ہیں' مونچھوں کی جگہ یا ٹھوڑی پہ بال ہوتے ہیں۔

جواب: آپ کا خیال درست ہے کہ اسلام دین فطرت ہونے کی بنا پر ہر اس کام کو پسند کرتا ہے جو تخلیق فطرت کے مطابق ہو اور ہر اس عمل سے روکتا ہے جو فطرت انسانی کے خلاف ہو۔ آپ کی یہ بات بھی درست ہے کہ عورت کی فطرت ہے کہ وہ اپنی خوب صورتی میں اضافہ چاہتی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ اگر پہلی بات درست ہے تو ایک عورت کے لیے چہرے کے بال صاف کرنا ممنوع کیوں ہے؟ اور کیا اس پر قیاس کرتے ہوئے ٹانگوں کے بالوں کی waxing بھی منع ہو گی؟ مزید یہ کہ کیا عورتوں کے لیے مونچھوں اور ٹھوڑی کے بال صاف کرنا بھی منع ہے؟

پہلے تو یہ بات واضح کرنے کی ضرورت ہے کہ فطرت ہے کیا؟ کیا فطرت ہر الٹی سیدھی خواہش کا نام ہے جو دل میں وسوسے کے طور پر آ جاتی ہو؟ یا فطرت سے مراد وہ سیدھا اور صالح طریقہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے ہر انسان بلکہ ہر مخلوق میں ودیعت کر دیا ہے' اور انسان کو چھوڑتے ہوئے تمام مخلوقات اس فطرت کی

بالالتزام پیروی کرتی ہیں۔ اس بات کو قرآن کریم نے "سنت اللہ" سے بھی تعبیر سے کیا ہے۔ قرآن کریم نے "سنت اللہ" کی اصطلاح کو ۲۰ کے قریب مقامات پر استعمال کیا ہے۔ اس میں قابل غور مقام سورۃ الاحزاب کی آیت نمبر۶۲ ہے جس میں فرمایا گیا: وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيلًا ○ "اور تم اللہ کی سنت میں کوئی تبدیلی نہ پاؤ گے"۔ اس بات کو سورہ فاطر میں یوں فرمایا گیا: فَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَبْدِيلًا ج (۳۵: ۴۳) اسی مضمون کو سورہ الفتح (۴۸:۲۳) اور بنی اسرائیل (۱۷:۷۷) میں بھی بیان فرمایا گیا ہے۔ ان تمام مقامات پر یہ بات فرمائی گئی ہے کہ تم دیکھو کہ اللہ کی سنت کبھی تبدیل نہیں ہوتی ہے۔ یعنی اس کے مقررہ اسوے، ضابطے، قوانین، فطری طریقے وہی ہیں جو ایک مرتبہ متعین کردیے گئے ہیں۔ سورہ الروم میں فطرت کے حوالے سے فرمایا گیا: فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ط لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ط (۳۰:۳۰) "قائم ہو جاؤ اس فطرت پر جس پر اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو پیدا کیا ہے۔ اللہ کی بنائی ہوئی ساخت بدلی نہیں جا سکتی"۔ اس کا ایک ترجمہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ: "اللہ کی بنائی ہوئی ساخت تبدیل ہی نہ کی جائے"۔

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ "بچہ جو کسی ماں کے پیٹ میں پیدا ہوتا ہے اصل انسانی فطرت پر پیدا ہوتا ہے۔ یہ ماں باپ ہیں جو اسے بعد میں عیسائی یا یہودی یا مجوسی بنا ڈالتے ہیں" (بخاری و مسلم)۔ گویا اگر انسان کو اس کی فطرت پر چھوڑ دیا جائے اور اس کے والدین، ماحول، روایات، رسوم اور توہمات اس پر کوئی اثر نہ ڈالیں تو وہ اللہ تعالیٰ کے بنائے ہوئے قوانین پر عمل کرے گا اور فطری طور پر اچھائی کی طرف راغب ہو گا۔ گویا انسانی معاشرہ اور انفرادی زندگی میں خرابی پیدا ہونے کا اصل سبب اس صالح فطرت سے انحراف اور اس کے مطالبات کو نظرانداز کرتے ہوئے نفسانی خواہشات کی پیروی ہے۔

یہاں یہ بات بھی واضح کر دی گئی کہ فطرت کے بنائے ہوئے قوانین سے ہر انحراف، فطری ساخت کو بدلنے کی ہر کوشش انسان کے لیے نقصان دہ ہو گی۔ اگر اللہ تعالیٰ نے ناک سانس لینے اور منہ کھانا کھانے کے لیے بنایا ہے اور انسان منہ سے سانس لینے اور ناک سے کھانا کھانا چاہے تو چاہے وہ ایسا کرنے میں کامیاب ہو جائے، یہ عمل اس کی صحت، بقا اور خود اعضا کی کارکردگی کے منافی ہو گا۔

اس تمہید کے بعد اب اصل سوال کا تجزیہ کیا جائے تو اس میں تین سوالات بنیادی ہیں: اولاً، کیا حدیث شریف میں چہرے کے بالوں سے مراد محض بھنویں ہیں یا اس میں عموم پایا جاتا ہے؟ ثانیاً، کیا اس ممانعت کا اطلاق جسم کے دیگر حصوں پر بھی ہو گا؟ اور ثالثاً، کیا ایک خاتون کا ٹھوڑی یا مونچھوں کے بالوں کو صاف کرنا خلاف فطرت قرار دیا جا سکتا ہے؟

حدیث شریف کے الفاظ یہ ہیں: لَعَنَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ النَّامِصَةَ وَالْمُتَنَمِّصَةِ (ابوداود) "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بال نوچنے والی پر اور اس عورت پر جو کسی سے یہ خدمت

لے' لعنت فرمائی ہے"۔ اس مضمون کی حدیث بخاری اور مسلم میں بھی حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے۔

ابوداؤد نے اپنی سنن میں "نامصہ" کی یہ تعریف بیان کی ہے کہ اس سے مراد وہ عورت ہے جو بھنوؤں میں نقش و نگار بنا کر اسے باریک کر دیتی ہے۔ گویا اس کا اطلاق بھنوؤں کے علاوہ چہرے کے کسی اور حصہ پر نہیں ہو گا۔ جب کہ امام نوویؒ نے چہرے کے بال صاف کرنے کو "نمص" میں شامل کیا ہے۔

الفتاویٰ الھندیہ (ج ۴' ص ۱۱۳) میں امام ابو یوسفؒ کی یہ رائے درج ہے کہ لَاَ بَاْسَ یَاْخذِ الْحَاجِبَیْنِ وَشَعْرِ وَجْھِہٖ مَالَاَ یَتَشَبَّہُ بِالْمُخَنَّثِ ' یعنی بھنوؤں اور چہرے کے بال اس طرح اکھاڑنے میں کوئی مضائقہ نہیں کہ مخنثوں سے مشابہت نہ ہو جائے۔

اس سے یہ بات تو واضح ہو گئی کہ بھنوؤں کے بال اس طرح تراشنا' نوچنا یا انھیں اس طرح ترتیب دینا جیسے فاحشہ عورتیں کرتی ہوں' یا مخنث کرتے ہوں' حرام ہے۔ بظاہر سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک خاتون کو جس حسن و صورت کے ساتھ پیدا کیا ہے اس میں کسی کی بھاری بھنویں اور کسی کی باریک بھنویں چہرے کی مناسبت سے بنائی ہیں۔ صرف کمان دار بھنویں حسن کی ضمانت نہیں ہیں۔ جو شخص خالق کائنات کے ذوق جمال کے مقابلے میں اپنے ذوق جمال کی بنا پر اس کو تبدیل کرتا ہے' ممکن ہے وہ اس طرح اپنی شکل کو کسی مشہور فلم ایکٹریس یا رقاصہ (جو فاحشہ کی تعریف میں آئیں گی) کی شکل جیسا تو بنا لے لیکن کیا حسن صرف نقالی اور تصنع ہی کا نام ہے؟ یا فطری حسن اپنی سادگی اور کشش میں مصنوعی حسن سے زیادہ جاذب ہو سکتا ہے؟

دوسرا پہلو مشابہت کا ہے۔ چونکہ مخنث اپنی بھنوؤں کو تراش خراش کر خواتین کی سی خوب صورتی پیدا کرنے کی کوشش کرتے تھے' اس لیے ان کی نقالی سے بچنا اس کا ایک سبب معلوم ہوتا ہے۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مَنْ تَشَبَّہَ بِقَوْمٍ فَھُوَ مِنْھُمْ "جو شخص کسی قوم کی مشابہت کرے گا وہ ان ہی میں سے ہو گا" (ابوداود)۔

اس مسئلے پر غور کا ایک پہلو یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آج جب unisex لباس' عطر' بالوں کی تراش وغیرہ کا رواج عام ہو گیا ہے' کیا یہ سمجھنا درست ہو گا کہ صرف مخنث ہی بھنوؤں کے بال نوچتے ہیں اور اس بنا پر ان کی مشابہت اختیار نہ کی جائے؟ ہم سمجھتے ہیں کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو بات بھی ارشاد فرمائی ہے وہ قیامت تک کے لیے حرف آخر کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس لیے بھنوؤں کے بال نوچنا بہرصورت ممنوع رہے گا۔

اس مسئلے کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ کیا بھنوؤں کے حکم کا اطلاق پورے چہرے پر ہو گا؟ جیسا کہ عرض کیا

گیا ہے؟ ابوداؤد نے خود اپنی سنن میں "نمص" کے مفہوم کو واضح کر دیا ہے کہ اس میں چہرے کے بال صاف کرنا شامل نہیں ہے۔ ابوداؤد کی اس وضاحت کو دو مزید نکات سے تقویت ملتی ہے۔ طبرانی کی روایت ہے کہ ابو اسحاق کی بیوی نے جو جوان تھیں اور خوب صورتی کی شائق تھیں حضرت عائشہؓ سے پوچھا: عورت اپنے شوہر کے لیے اپنے رخسار کے بال صاف کر سکتی ہے؟ حضرت عائشہؓ نے فرمایا: "اذیت کو ممکن حد تک دور کرو" (فتح الباری، کتاب اللباس)۔ گویا جس طرح ایک شادی شدہ مومنہ کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ اپنے آپ کو ایسا رکھے کہ اس کا شوہر اسے دیکھ کر خوش ہو جائے۔ اگر ایک خاتون کی ٹھوڑی یا مونچھوں کی جگہ رواں اتنا بھاری ہے جیسا مردوں کے ہوتا ہے تو اپنی نسوانیت برقرار رکھنے، اور مردوں کی مشابہت اختیار نہ کرنے کے حکم کی پیروی کرتے ہوئے اسے ان بالوں کو صاف کرنا چاہیے۔ یہی مطالبہ فطرت ہے۔ اگر ایسا نہیں کرے گی اور اس کی ٹھوڑی میں تین تین انچ لمبے چار بال اور مونچھوں کی جگہ پر دبیز رواں ہو گا تو جب بھی اس کا شوہر اس کے قریب آئے گا تو یہ بات نہ شوہر کی خوشی کا باعث بنے گی اور نہ رشتے کی قربت میں مددگار ہو گی۔

صحابہ کرامؓ سے زیادہ تقویٰ، صالحیت اور دنیا سے عدم رغبت کسے ہو گی، لیکن جب ایک صحابیؓ ایک صحابیہؓ کو ایسے حال میں دیکھتے ہیں جیسے وہ بیوہ ہو گئی ہوں، تو پوچھتے ہیں کہ تم نے یہ شکل کیوں بنائی ہوئی ہے؟ وہ بتاتی ہیں کہ تمھارے بھائی کو نماز اور روزوں سے فرصت نہیں ملتی۔ یہ صحابیؓ ان کے شوہر کو پکڑ کر لاتے ہیں، ان کا نفلی روزہ افطار کراتے ہیں اور دونوں کو مشورہ دیتے ہیں کہ وہ ایک دوسرے کا حق ادا کریں۔ گویا ایک مومنہ کا اپنے شوہر کے لیے چہرے کے بال صاف کرنا اس بندش میں قطعاً نہیں آتا جس کا ذکر بھنوؤں کی صفت میں آیا۔

جہاں تک سوال ایک خاتون کا بانہوں یا ٹانگ پر سے بالوں کو waxing سے صاف کرنا ہے، اس کا مقصد نہ تو ہر راہ گیر کو ٹانگ کھول کر یا بانہوں پر سے حجاب اتار کر اپنی خوب صورتی دکھانا ہے اور نہ ایسا کرنے کا مقصد خود کو مرد بنانا ہے۔ ظاہر ہے ایک مومنہ، جسے اپنے تمام جسم کو، سوائے چہرے اور ہاتھ کے، ڈھکنے کا حکم ہے، اگر وہ زیر لباس اپنی ٹانگوں یا بانہوں کے بال صاف کر کے مناسب لباس سے اسے چھپائے رہتی ہے، تو اس میں کون سے حکم شرعی کی خلاف ورزی ہوتی ہے؟ بلکہ اگر ایک خاتون اپنی ٹانگوں اور بانہوں پر مردوں جیسے گھنے بال خاص قسم کے روغنیات کی مدد سے اُگائے گی تو فطرت کی خلاف ورزی کرے گی۔ واللہ اعلم بالصواب (ڈاکٹر انیس احمد)۔

رشتے میں حسب نسب کا لحاظ

س : آپ نے لکھا ہے ("رسائل و مسائل" جون ۱۹۹۹) کہ شرط صرف یہ ہے کہ لڑکی ایسے لڑکے سے شادی کا مطالبہ نہ کرے جو اس سے خاندانی' دینی اور پیشے کے لحاظ سے کم تر حیثیت کا مالک ہو۔ اگر اسلام میں بھی ہندومت کی طرح ادنیٰ اور اعلیٰ کی تمیز ہے تو پھر ہم ذات برادری کے چکر سے کیسے نکل سکتے ہیں؟ ایک موچی یا حجام کو جو محنت مزدوری کرتا ہے' کم تر کیوں سمجھا جائے؟ میرے خیال سے اگر لڑکے کی سیرت اچھی ہے' رزق کے ذرائع حلال ہیں' تو خاندان اور پیشے کی قید لگانا درست نہیں۔ ایک دینی رسالے میں اس طرح کی بات لوگوں کو دین سے دور کرتی ہے۔

ج : "کفو" کے مسئلے میں آپ نے جو لکھا ہے وہ بالکل صحیح ہے۔ اسلام میں فضیلت کا دارومدار ایمان اور علم و عمل ہے۔ حسب نسب اور پیشہ' فضیلت کے معیار نہیں ہیں۔ جن فقہا نے "کفو" کا لحاظ کیا ہے وہ اس حقیقت کو مانتے ہیں۔ انھیں اس سے اختلاف نہیں ہے اور اسی بنا پر تمام فقہا کا اس بات پر اجماع ہے کہ اگر ایک شخص مسلمان ہو تو کسی بھی حیثیت اور درجے کی خاتون کا اس سے نکاح جائز ہے۔ اگر لڑکی اور اس کے اولیا دونوں راضی ہوں تو کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ فقہا نے "کفو" کے مسئلے کو اللہ تعالیٰ کے ہاں فضیلت اور درجہ اور اسلامی حکومت میں کسی عہدے اور منصب کے لیے اس کے امتیاز کی وجہ سے نہیں بلکہ دنیوی فوائد اور نقصانات کے لحاظ سے تسلیم کیا ہے۔ اس لیے کہ مسئلہ صرف یہ نہیں ہے کہ مرد اور عورت کا آپس میں نکاح ہو جائے بلکہ اسے باقی اور مستحکم رکھنے اور دونوں خاندانوں کے درمیان تعلقات کو استوار کرنے کا بھی ہے۔ اور ظاہر بات ہے کہ دنیا میں رہتے ہوئے لوگ دینی حیثیت کے ساتھ دوسری حیثیتوں کو بھی مدنظر رکھتے ہیں۔ اسلام ان کو دینی حیثیت کو ملحوظ رکھنے کے ساتھ دوسری حیثیتوں کو ملحوظ رکھنے کی اجازت دیتا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خود فرمایا: اَلْمَرْاَۃُ تُنْکَحُ عَلٰی دِیْنِھَا وَمَالِھَا وَجَمَالِھَا فَعَلَیْكَ بِذَاتِ الدِّیْنِ تَرِبَتْ یَدَاكَ (ترمذی' کتاب النکاح)' عورت کے ساتھ نکاح اس کے دین' مال اور جمال کی بنیاد پر کیا جاتا ہے۔ پس تم دین والی کو ترجیح دو۔

جس طرح ایک لڑکا' لڑکی کی مختلف خوبیوں کو پیش نظر رکھتا ہے' اس طرح لڑکی اور لڑکی کے اولیا بھی لڑکے کے اندر مختلف خوبیاں تلاش کرتے ہیں۔ دین داری کے ساتھ وہ ان خوبیوں کو پیش نظر رکھ کر رد و قبول کا فیصلہ کر سکتے ہیں۔ اس بات میں کسی کا اختلاف نہیں ہے۔ اختلاف اس صورت میں ہے کہ جب لڑکی نے ایک شخص کو پسند کر لیا درآں حالیکہ وہ دنیوی خوبیوں کے لحاظ سے اس کے مقابلے میں کمتر درجے کا تھا اور ورثا اس پر راضی نہ ہوئے تو پھر کس کی بات کا اعتبار ہو گا؟ اسی طرح اگر ورثا نے ایسے شخص کو پسند

کر لیا جو دنیوی وسائل کے لحاظ سے اس سے کم تر درجے کا تھا' لیکن لڑکی راضی نہیں ہے تو پھر کیا ہو گا؟ دونوں صورتوں کا حکم ایک ہے کہ پھر کسی ایسے شخص کو منتخب کیا جائے جس پر دونوں راضی بھی ہوں اور وہ لڑکی سے دنیوی درجہ میں کم تر بھی نہ ہو۔ اگر ایسی صورت پر اتفاق نہ ہو سکے تو پھر لڑکی کی رضا مقدم ہو گی بشرطیکہ لڑکا درجے میں اس سے کم تر نہ ہو۔ اس شرط کی وجہ یہ ہے کہ لڑکی کو شوہر کے تابع ہو کر رہنا ہے اور تابع کے لیے ضروری ہے کہ وہ ایسی پوزیشن میں ہو کہ متبوع کی اتباع کر سکے' اس کی طرف سے کوئی بھی رکاوٹ نہ ہو اور خاندان کی طرف سے بھی رکاوٹ نہ ہو۔ دنیوی' دینی اور اخلاقی لحاظ سے درجات کا فقہا نے جو اعتبار کیا ہے اس پر شروع دن سے تعامل ہے۔ دینی اور اخلاقی حیثیت کے ساتھ پیشے کی حیثیت کو اس حد تک شریعت نے ملحوظ رکھا ہے کہ اگر لڑکی ان حیثیتوں میں لڑکے سے فائق ہو تو پھر مشورے اور اتفاق سے نکاح ہو' اس کے بغیر لڑکی نکاح نہ کر سکے۔ اس میں لڑکی' لڑکے اور دونوں خاندانوں کا فائدہ ہے اور نکاح کے رشتے کے دوام اور استحکام کا موجب ہے۔

دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ اس سے دنیوی سہولتوں میں فرق پڑتا ہے۔ ایک حجام و دھوبی اور صفائی کے پیشے سے تعلق رکھنے والے شخص کو اٹھنے بیٹھنے اور رہن سہن کی وہ سہولتیں حاصل نہیں ہوتیں جو ایک علمی گھرانے کی چشم و چراغ لڑکی کو حاصل ہوتی ہیں۔ ایسی صورت میں اگر نکاح ہو گیا تو کتنی دیر تک گزارہ ہو سکے گا؟ لڑکی کے رشتے دار کتنے عرصے تک تعلقات قائم رکھ سکیں گے؟ اس کے مقابلے میں اگر باہمی مشورے اور رضامندی سے ایسا ہو تو پھر امید پیدا ہو جاتی ہے کہ رشتہ مستحکم رہے گا اور لڑکی اور اس کے اولیا مشکلات برداشت کرنے کے لیے تیار رہیں گے۔ اس لیے ہمیشہ دین دار لوگ بھی اپنی لڑکی کے لیے رشتہ دیکھتے وقت دینی حیثیت کے ساتھ دوسری سہولتوں کو بھی پیش نظر رکھتے ہیں۔ دوسری سہولتوں کو پیش نظر رکھنا دین کے منافی نہیں ہے کیونکہ دین اس کی اجازت دیتا ہے۔ دین تو صرف اس بات کی مخالفت کرتا ہے کہ دین کو نظرانداز کر کے محض دنیوی حیثیتوں کی بنا پر رشتے کیے جائیں یا دنیوی حیثیتوں کو فضیلت' مقام و مرتبے کا معیار سمجھا جائے (**مولانا عبدالمالک**)۔

کتاب نما

تفسیری ترجمۂ قرآن مجید' محمد رفیق چودھری۔ ناشر: مکتبہ قرآنیات' لاہور۔ صفحات' اول: ۲۷۲' دوم: ۵۴۷۔
ہدیہ: درج نہیں۔

مترجم لکھتے ہیں: "برسوں سے آرزو تھی کہ قرآن مجید کا کوئی ایسا ترجمہ ہو جو عام اردو خوانوں کے لیے قرآن فہمی کی ضرورت کو پورا کرے' جسے سمجھنے کے لیے حاشیوں' بریکٹوں اور تفسیروں کی ضرورت نہ پڑے' جو اپنی وضاحت آپ کرنے والا (self-explanatory) ہو۔ ایک عام آدمی جب اسے پڑھے تو ساتھ ہی ساتھ قرآن مجید کا سیدھا سادا اور صحیح مفہوم اخذ کرتا چلا جائے" (ص ۳)۔ اردو میں قرآن پاک کے بیسیوں بلکہ سیکڑوں ترجموں کے باوجود مترجم کے نزدیک' یہی بات ایک نئے ترجمے کا جواز ہے۔ مترجم قرآن پاک کے سابقہ مترجمین کی خدمات کے معترف ہیں' اس کے باوجود انھوں نے ایک نئے ترجمے کی ضرورت محسوس کی مگر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ زیر نظر قابل قدر کاوش اردو میں تراجم قرآن کی خاتم نہیں ہے' اور مزید بہتر ترجمے بلکہ تراجم کی گنجایش باقی رہے گی۔ قرآن' کلام الٰہی ہے اور اس کی زبان عربی مبین ہے' چنانچہ اس کا مفہوم خواہ کتنے ہی عمدہ سے عمدہ الفاظ اور بہتر سے بہتر اسلوب میں ادا کرنے کی کوشش کی جائے' ترجمۂ قرآن کا حق ادا نہیں ہو سکتا۔

محمد رفیق چودھری صاحب نے زیر نظر "تفسیری ترجمے" میں قوسین کا استعمال نہیں کیا اور اس کے بغیر موزوں کلمات ربط کا اضافہ کر کے ترجمے کی عبارت کو مربوط بنانے کی کوشش کی ہے [راقم کو اس بات سے اتفاق نہیں ہے کہ "جملے کے درمیان میں قوسین کا بار بار آنا تسلسل مطالعہ میں حارج ہوتا ہے" (ص ۶)۔ قوسین تو اصل الفاظ تراجم اور وضاحتی الفاظ کے درمیان تمیز کرنے کے لیے استعمال ہوتے ہیں اور مطالعے میں رکاوٹ نہیں بنتے۔ اس اعتبار سے قوسین کی ضرورت اور افادیت میں کلام نہیں]۔ مترجم نے ترجمے میں پیرا بندی بھی کی ہے۔

مترجم نے قرآن پاک کے ذخیرہ تراجم اردو سے استفادہ کیا ہے اور اس میں انھوں نے سب سے زیادہ اثر تفہیم القرآن سے لیا ہے۔ جہاں تفہیم القرآن کا ترجمہ بامحاورہ اور عالمانہ ہے' رفیق صاحب نے اسے آسان اور سلیس بنا دیا ہے۔ اس طرح یہ ترجمہ نسبتاً آسان اور سلیس ہے لیکن تاثیر' زور اور بلاغت کے اعتبار سے مولانا مودودیؒ کا ترجمہ فائق ہے' مثلاً: وَقَدْ مَكَرُوْا مَكْرَهُمْ وَعِنْدَ اللّٰهِ مَكْرُهُمْ ط وَاِنْ كَانَ

مَكْرُهُمْ لِتَزُوْلَ مِنْهُ الْجِبَالُ ○ (ابراھیم ۱۴:۴۶)

تفہیم القرآن: "انھوں نے اپنی ساری ہی چالیں چل دیکھیں، مگر ان کی ہر چال کا توڑ اللہ کے پاس تھا اگرچہ ان کی چالیں ایسی غضب کی تھیں کہ پہاڑ ان سے ٹل جائیں"۔

تفسیری ترجمہ: "ان پہلے لوگوں نے بھی اپنی چالیں چلیں، اور ان کی ساری چالیں اللہ کے سامنے تھیں۔ اگرچہ ان کی چالیں ایسی تھیں کہ ان سے پہاڑ بھی اپنی جگہ سے ہل جاتے"۔

اس مثال میں "ان کی ساری چالیں اللہ کے سامنے تھیں" (تفسیری ترجمہ) کے مقابلے میں "ان کی ہر چال کا توڑ اللہ کے پاس تھا" (تفہیم) میں زیادہ زور ہے۔ اسی طرح "ان کی چالیں ایسی تھیں" (تفسیری ترجمہ) کے مقابلے میں ان کی چالیں ایسی غضب کی تھیں" (تفہیم) میں زیادہ زور ہے۔

ایک اور مثال لیجیے: وَالزَّرْعَ مُخْتَلِفًا اُكُلُهٗ (الانعام ۶:۱۴۱)

تفہیم القرآن: "کھیتیاں اگائیں جن سے قسم قسم کے ماکولات حاصل ہوتے ہیں"۔

تفسیری ترجمہ: "کھیتیاں پیدا کیں جن کے پھل مختلف قسم کے ہوتے ہیں"۔

اس مثال میں مُخْتَلِفًا اُكُلُهٗ کے ترجمے کو "پھل مختلف قسم کے" تک محدود کر دینا درست نہیں ہے۔ "قسم قسم کے ماکولات" سے مفہوم زیادہ واضح ہوتا ہے۔

مترجم نے اسے "تفسیری ترجمہ" کے طور پر پیش کرتے ہوئے کہا ہے کہ یہ ایک حد تک کئی تفسیری کتب کی ورق گردانی سے قارئین کو بے نیاز کر دے گا (ص ۱۰)۔ ہمارے خیال میں یہ بے نیازی تو تبھی ممکن ہے جب ترجمے کا حق ادا ہو جائے اور وہ ممکن ہی نہیں (مثلاً: زیر نظر ترجمہ میں "طاغوت" کا ترجمہ "شیطان" کیا گیا ہے (ص ۸۲)، ظاہر ہے کہ اس سے پورا مفہوم ادا نہیں ہوتا)۔ بہرحال محمد رفیق چودھری صاحب کی یہ کاوش مستحسن ہے۔ نیک نیتی کے ساتھ قرآن حکیم کے پیغام کو زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچانے کی ہر کاوش قابل داد ہے اور اس کا اجر اللہ کے پاس ہے (رفیع الدین ہاشمی)۔

تفہیم الاحادیث (پنجم)، سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ، مرتبہ: عبدالوکیل علوی۔ ناشر: ادارہ معارف اسلامی، منصورہ، لاہور۔ صفحات: ۶۴۹۔ قیمت: درج نہیں۔

کسی بڑے انسان کی عظمت کا ایک رخ یہ بھی ہوتا ہے کہ اس کے کارنامے کی توضیح و تشریح اور تعبیر و تفسیر کا کام مدتوں جاری رہتا ہے۔ مولانا مودودیؒ اس اعتبار سے ایک نابغہ عصر تھے کہ ان کے علمی کارنامے پر بہت کچھ لکھنے لکھانے اور اس پر تحقیقی و تنقیدی اور تفسیری کام کی گنجایش موجود ہے۔ تفہیم الاحادیث بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ "مولانا مودودیؒ نے تفہیم القرآن اور دوسرے تصنیفی ذخیرے میں مختلف احادیث کا ذکر کیا، حوالہ دیا یا بعض احادیث کو مکمل یا جزوی طور پر نقل کیا اور کہیں متن کے ساتھ یا بلا متن

صرف ترجمہ دینے پر اکتفا کیا"۔ فاضل مرتب علوی صاحب نے مولانا مرحوم کی تمام تصانیف کو کنگھال کر ان کے ہاں مذکور' جملہ احادیث جمع کیں' ان کے متن تلاش کیے' جہاں مولانا نے کسی حدیث کا صرف ایک جز استعمال کیا' علوی صاحب نے وہ پوری حدیث تلاش کر کے نقل کی اور پھر عربی متون کے ترجمے بھی دیے۔ اس سلسلے کی پانچویں جلد اس وقت پیش نظر ہے (سابقہ جلدوں پر تبصرہ دیکھیے: مئی اور ستمبر ۱۹۹۸)۔

زیر نظر جلد اسلام کے نظام معاشرت اور ایک حد تک نظام قانون سے متعلق ہے۔ اس میں نکاح' کفاء ت' ولایت' رضاعت' ممنوعات' مہر' طلاق' خلع' عدت' ایلاء' ظہار' پردہ' لباس' ستر' مرد و زن کے حقوق و اختیارات اور حدود اور تعزیرات (قطع ید' شراب نوشی' زنا' قذف' رجم' قتل خطا' قتل مرتد) کے متعلق احادیث نبویؐ یک جا کر کے اسلامی احکام کی وضاحت کی گئی ہے۔ مولانا مودودیؒ نے مختلف موضوعات سے متعلق دینی احکام کی حکمتوں کو اپنی مختلف کتابوں میں بیان کیا ہے۔ ان تحریروں کو بھی متعلقہ موضوع کے ساتھ منسلک کر دیا گیا ہے۔ بلاشبہ مولف نے احادیث پر تحقیقی کام نہایت جان فشانی اور غیر معمولی محنت کے ساتھ انجام دیا ہے۔ ہر حدیث کے ساتھ اس کی سند اور صحت کی وضاحت بھی موجود ہے۔ اس کتاب کی حیثیت زیر بحث موضوعات پر ایک لحاظ سے ایک عمدہ تحقیقی مجموعۂ احادیث کی ہو گئی ہے۔ امید ہے طلبہ' اساتذہ اور علما کے ساتھ عام قارئین کے لیے بھی یہ مجموعہ استفادے اور فائدہ و فیضان کا باعث ہو گا (ر - ہ)۔

کیا امریکہ جیت گیا؟' مرتبہ: محمد متین خالد۔ ناشر: علم و عرفان پبلشرز' عقب میاں مارکیٹ' اردو بازار' لاہور۔ صفحات: ۳۸۶۔ قیمت: ۲۰۰ روپے۔

یہود و نصاریٰ کی جانب سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس پر اتہام و دشنام کی روایت خاصی پرانی ہے۔ شان رسالتؐ میں گستاخی کے لیے "مستشرقین" کی ایک کھیپ تو انھوں نے اپنے ہاں سے تیار کی اور دوسری کھیپ مسلمان گھرانوں میں جنم لینے والے فریب خوردہ لوگوں میں سے منظم کی۔ انھی لوگوں میں مرزائے قادیان کا نام بھی آتا ہے۔ یہ معاندانہ روایت مختلف ادوار میں' مختلف رنگ لیے چلتی رہی' لیکن ہر کوشش کا حتمی نشانہ خاتم الانبیا صلی اللہ علیہ وسلم ہی کو بنایا گیا۔

ہندستان میں انگریزوں کی سرپرستی میں مسلمانوں اور رسول اکرمؐ کے خلاف ہرزہ سرائی کی ایک روایت بھی رہی ہے۔ وطن عزیز میں اس صدی کے آٹھویں عشرے میں بعض عیسائیوں نے اپنی گستاخانہ سرگرمیوں میں تسلسل پیدا کیا۔ پھر اشتراکی روس کے حامی دانش وروں نے (اپنا قبلہ تبدیل کر کے امریکہ کی چوکھٹ پر جبین نیاز جھکائی اور) پھر گستاخی رسالتؐ کے مرتکب لوگوں کے پشتی بان کا کام اپنے ذمے لے لیا۔ جنرل محمد ضیاء الحق مرحوم کے زمانۂ صدارت میں' ایسی گستاخیوں پر اور اس کے نتیجے میں معاشرے کو

تصادم سے بچانے کے لیے پاکستان کے ضابطہ فوج داری دفعہ ۲۹۵ سی کی صورت میں ترمیم ہوئی' جس کے مطابق گستاخی رسالتؐ کے مرتکب فرد کے لیے سزاے موت تجویز کی گئی۔ اس سزا پر اگرچہ آج تک عمل تو نہیں ہو سکا تاہم اس کے تحت متعدد گستاخان رسولؐ پکڑے گئے اور ان کے لیے "انسانی حقوق" اور "ہمدردی" کے نام پر مسلمانوں کے سے ناموں والے کئی لوگوں نے غوغا آرائی بھی کی۔

محمد متین خالد نے' اسی دفعہ کے حوالے سے مختلف اوقات میں تحریر شدہ وضاحتی مضامین کو بڑی محنت سے تلاش کر کے یک جا کیا ہے۔ یہ مضامین غیرت ایمانی اور حلاوت دینی کا گلدستہ ہیں' جس میں عشق رسالتؐ کی خوشبو رچی بسی ہے۔ جسٹس ڈاکٹر محمود احمد غازی کا مضمون "توہین رسالتؐ کا قانون: سماجی' سیاسی اور تاریخی مطالعہ" گویا اس کتاب کی جان ہے۔ سبط الحسن ضیغم کا مضمون "توہین رسالتؐ کا پس منظر" بھی فکرانگیز ہے۔ فاضل مرتب نے یہ کتاب ترتیب دے کر نہ صرف مسلمانوں کے موقف کو پیش کیا ہے' بلکہ پیپلزپارٹی اور مسلم لیگ کے پردے میں سیاسی کھیل کے کھلاڑیوں کی سیکولر سوچ کو بھی بے نقاب کر دیا ہے۔ کتاب کا نام اگرچہ زیر بحث موضوع کی قرار واقعی نمایندگی نہیں کرتا' تاہم اس دفعہ کے خاتمے کے لیے امریکہ بہادر کی کھلی چھپی سازشوں کو ہدف بناتے ہوئے مضامین پیش کیے گئے ہیں۔ پیپلزپارٹی کے مزاج میں رچی بے دینی کے لیے گویا کہ قوم کے مذہبی عناصر میں اجماع کی سی کیفیت ہے' لیکن مسلم لیگ کی دین داری کا بھی ایک سرا پسپائی اور مداہنت سے ملتا ہے۔

مذکورہ دفعہ میں ترمیم کے لیے معذرت خواہانہ لہجہ اختیار کرنے والے بعض مسلم لیگی وزرا کے بیانات (ص ۳۱) کی بنیاد پر مرتب نے شک کا اظہار کیا ہے کہ کیا یہ حکومت بھی امریکہ کے سامنے گھٹنے ٹیک دے گی؟ یہاں گھٹنے ٹیکنے سے مراد ہے: قانون توہین رسالتؐ پر عمل درآمد کا خاتمہ اور پاکستانی مسلمانوں کے غیرت دین کی پسپائی کی الم ناک روداد۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اگر قوم بیدار رہے' اور قوم کے اہل قلم اپنی تحریروں کو جذبات سے زیادہ دلائل سے مزین کریں' اور سچائی اور غیرت دینی کا برملا اظہار کریں' تو اللہ تعالیٰ ان کی کوششوں میں ضرور برکت عطا فرمائے گا (**سلیم منصور خالد**)۔

بلوچستان میں نونہالوں کا ادب' ڈاکٹر انعام الحق کوثر۔ ناشر: سیرت اکادمی بلوچستان' ۲-۷۲-اے' او بلاک III' سٹیلائٹ ٹاؤن' کوئٹہ۔ صفحات: ۲۱۹۔ قیمت: ۲۰۰۔

تعلیم و تعلّم اور تحریر و تصنیف کی دنیا میں ڈاکٹر انعام الحق کوثر کا نام محتاجِ تعارف نہیں ہے۔ وہ نصف صدی سے پاکستان کے سب سے کم ترقی یافتہ صوبے میں اپنی علمی' تعلیمی اور دینی خدمات جاری رکھے ہوئے ہیں۔ طویل عرصے تک محکمہ تعلیم میں خدمات انجام دے کر سبک دوشی کے بعد' اب ان کی توجہات تصنیف و تالیف پر مرکوز ہیں۔

ان کی زیر نظر' نئی تصنیف میں بلوچستان میں نونہالان قوم کے لیے تیار کردہ ادب کا ایک جائزہ لیا گیا ہے۔ اس جائزے میں بچوں کے لیے لکھی جانے والی کتابوں' رسالوں' اخبارات اور متفرقات کا ذکر اور ان پر تبصرہ بلکہ بعض کا خلاصہ شامل ہے۔ بلوچستان کے جن قلم کاروں نے بچوں کے ادبی ذخیرے میں اضافہ کیا' مضامین' ڈرامے' کہانیاں اور نظمیں لکھیں' ان کا تعارف بھی کرایا گیا ہے بلکہ ان کے پتے بھی دیے گئے ہیں۔ اردو کے علاوہ مقامی زبانوں (براہوی' بلوچی' پشتو وغیرہ) میں تیار شدہ نونہال ادب کا ذکر بھی کتاب میں شامل کر دیا گیا ہے۔

مصنف کا تاثر یہ ہے کہ بچوں کے ادب پر بلوچستان میں دوسرے صوبوں کے مقابلے میں نسبتاً کم کام ہوا ہے۔ اس کے اسباب میں عمومی ناخواندگی' طباعتی سہولتوں کی کمی' اور اہل قلم کی مصروفیات کے علاوہ اس امر کو بھی دخل ہے کہ اسکولوں کی لائبریریوں کے لیے بچوں کی کتابیں بہت کم خریدی جاتی ہیں۔ زیر نظر کتاب کی نوعیت تجزیاتی ہونے کے ساتھ ساتھ تحقیقی بھی ہے۔ مصنف موضوع پر بہت اچھی دسترس رکھتے ہیں۔ اکادمی ادبیات پاکستان جیسے اداروں سے یہ توقع بے جا نہ ہو گی کہ وہ اس نوعیت کے جائزوں کی بنا پر متعلقہ شعبوں میں بہتر ادب تیار کرانے کے لیے منصوبہ بندی کرے۔ (ر-ہ)

Year Book of Daʿwah - Europe' مرتبہ: لطف الرحمٰن فاروقی۔ ناشر: دعوہ اکیڈمی' بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی اسلام آباد' پوسٹ بکس ۱۴۸۵' اسلام آباد۔ صفحات: ۴۰۳۔ قیمت: درج نہیں۔

دعوہ اکیڈمی' اسلام آباد کی بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی کا ایک فعال شعبہ ہے' جو دعوت و تبلیغ کے میدان میں ہمہ جہتی مقاصد رکھتا ہے۔ اس کے پروگراموں میں اساتذہ' ائمہ' طلبا' اہل قلم اور معاشرے کے دیگر ذمہ داران کے لیے تربیت گاہوں کا انعقاد' دعوتی لٹریچر کی تیاری اور مختلف النوع رپورٹوں اور جائزوں وغیرہ کی اشاعت شامل ہے۔ زیر نظر کتاب بھی تحقیقی نوعیت کی ایک معلوماتی کتاب ہے جسے اکیڈمی کے ریسرچ ایسوسی ایٹ' لطف الرحمٰن فاروقی صاحب نے بڑی کاوش اور محنت کے ساتھ مختلف ذرائع اور مآخذ کی مدد سے مرتب کیا ہے۔

یہ ایک طرح کی اسلامی دعوتی ڈائرکٹری ہے جس میں یورپ کے مختلف ملکوں میں قائم اور مصروف کار اسلامی تنظیموں' ان سے وابستہ شخصیات اور ان کے دعوتی منصوبوں کے بارے میں مختصر معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ مختلف یورپی ممالک کے بارے میں عمومی بنیادی معلومات (آبادی' رقبہ' زبان' مذہب اور مختلف مذاہب کے پیروکاروں کی تعداد وغیرہ) پھر مختلف زبانوں میں اسلامی لٹریچر کی تفصیل جن میں قرآن حکیم' احادیث' تفاسیر' کتب تاریخ' فقہ' وغیرہ کی نشان دہی کی گئی ہے۔ یہ بھی بتایا گیا ہے کہ قادیانی قرآن پاک کا (اپنا) ترجمہ یورپ کی ۲۸ زبانوں میں کر چکے ہیں (ر-ہ)۔

کشمیر: حقائق کے آئینے میں' منیر احمد بخاری۔ ناشر: احباب پبلشرز' ۴۰ شمع پلازہ' لاہور۔ صفحات: ۵۰۰۔ قیمت: ۲۰۰ روپے (مجلد)۔

کشمیر' ہمارے جسد ملی کا وہ مجروح حصہ ہے کہ جس کے کرب و الم سے' بدقسمتی سے امت مسلمہ بے خبر نہیں تو لاتعلق ضرور ہے۔ یہ لاتعلقی ایک کشمیر ہی سے نہیں' داغستان 'کوسووا' مورولینڈ' اراکان اور چیچنیا سے بھی ہے۔ جس کا بڑا سبب مسلم ممالک میں استعمار دوست حکمرانوں کا اقتدار بھی ہے اور خود وہاں کے اہل علم و دانش کا جعل و جہل بھی۔ علم' وسعتوں کا پیامی اور جہالت کا دشمن ہوتا ہے' مگر جن لوگوں کی رگ جاں پیسے کی ڈور سے بندھی ہے' انھیں' جسد ملی کے رستے ہوئے ناسوروں پر پھاہا رکھنے کی فرصت ہی نہیں' نہ انھیں اس ضرورت کا احساس ہے۔

ایسی صورت حال میں جب کوئی صاحب قلم' ملت کے مسائل پر لکھنے کے لیے قلم اٹھاتا ہے تو یہ عمل بڑا خوش گوار لگتا ہے۔ ایسے ہی نوجوان اصحاب قرطاس و قلم میں ایک نام منیر احمد بخاری کا ہے جنھوں نے مسئلہ کشمیر کے حقیقی تناظر کو سمجھنے' پھر اس کو ایک متوازن اور مصدقہ اسلوب میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ کتاب میں کشمیر کے بارے میں سیاسی' سماجی' معاشی' بین الاقوامی اور عسکری اہداف و معاملات کو حسن ترتیب سے پیش کیا گیا ہے۔ جس سے نہ صرف موجودہ تحریک جہاد کشمیر کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے' بلکہ کشمیر کی تاریخ اور تحریک حریت کشمیر کے نشیب و فراز سے بھی آگہی حاصل ہوتی ہے۔

کتاب کی تقریظات جناب قاضی حسین احمد اور جناب غلام محمد صفی نے تحریر کی ہیں۔ (س - م - خ)

سوے حرم چلا' سید جلال الدین عمری۔ ناشر: مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز' نئی دہلی۔ صفحات: ۶۰۔ قیمت: ۱۲ روپے۔

مولانا سید جلال الدین عمری بھارت کی نامور علمی شخصیت ہیں۔ ۱۹۹۷ میں انھیں دوبارہ حج کی سعادت میسر آئی۔ اس میں حج کی تاریخ' مقاصد و معنویت کے ساتھ ضروری احکام و مسائل کا ذکر بھی آگیا ہے۔ سعودی عرب میں مقیم دوست احباب کا تذکرہ بھی ہے۔ حج کے سفرناموں میں یہ ایک مفید اور دلچسپ اضافہ ہے (ر - ہ)۔

مدیر کے نام

سید رضوان علی ندوی، کراچی

آپ نے میری کتاب تحریک اخوان المسلمون کے ایک حصہ کی تلخیص شائع کی، بہت مناسب و مربوط ہے (ستمبر ۹۹)۔ استاذی مرحوم پروفیسر شیخ مصطفیٰ الزرقاء کے نام کا آخری حصہ درست نہیں لکھا گیا۔ صحیح نام مصطفیٰ احمد الزرقاء ہے (یعنی زرقاء الف لام اور آخر میں ہمزے کے ساتھ ہے)۔ ان کی کتاب المدخل الفقہی العام پر نام یوں ہی ثبت ہے جو دمشق کے زمانۂ طالب علمی سے اب تک میرے پاس محفوظ ہے، یعنی تقریباً ۴۵ سال سے۔ وہ دمشق یونی ورسٹی کے کلیۃ الشریعۃ میں فقہ اسلامی کے میرے استاد تھے اور اسی زمانے میں استاذی ڈاکٹر معروف الدوالیبی کی وزارت میں وزیر انصاف مقرر ہوئے تھے۔

فکر و نظر کے شمارہ خصوصی "برصغیر میں مطالعۂ قرآن" پر تبصرہ کرتے ہوئے مولانا عبدالمالک نے ایک مضمون نگار پر صرف یہی اعتراض کیا ہے کہ مضمون نگار نے وحید الدین خاں اور ڈاکٹر اسرار احمد کا ذکر مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی اور مولانا امین احسن اصلاحی سے پہلے کر دیا ہے، حالانکہ کوئی منصف مزاج اور صاحب نظر مسلمان کم از کم وحید الدین خاں کا ذکر مطالعۂ قرآن سے متعلق کسی مضمون میں کرے گا ہی نہیں، ہاں تحریف قرآن پر کوئی مضمون ہو تو اس میں ان کا ذکر ضرور آئے گا۔

"تحریک اسلامی اور خواتین کا کردار" کے صفحہ ۲۹ پر بہت سے نام غلط طبع ہوئے ہیں، کچھ واضح نہیں ہیں، ام عمارہ.... بنت کعب کے درمیان میں جو نام ہے وہ نسیبہ ہے۔ المسیرۃ الحلبۃ کے بجائے السیرۃ الحلبیۃ ہونا چاہیے، پھر صحیح نام حمنہ بنت حجش ہے۔ البلۃ الغفاریۃ کے بجائے لیلیٰ الغفاریۃ ہونا چاہیے۔ "ام جاران بنت منخان" کے بجائے ام حرام بنت ملحان ہونا چاہیے، یہ مشہور صحابیہ تھیں۔

محمد فیصل قریشی، کراچی

تحریک اسلامی میں خواتین کا کردار (ستمبر ۱۹۹۹) میں صاحب مضمون نے ایک ایسے مسئلے کی طرف توجہ دلائی ہے جسے بدقسمتی سے وہ توجہ نہیں مل رہی جو اس کا حق ہے۔ ہماری خواتین ان حقوق سے ناآشنا ہیں جو دین نے ان کو معاشرے کے اجتماعی امور میں موثر اور مثبت کردار ادا کرنے کے لیے عطا کیے ہیں۔ ڈاکٹر فضل الرحمٰن فریدی نے مدینہ منورہ کے معاشرے کی مثال دے کر مغربی چیلنج کا موثر مقابلہ کرنے کا راستہ دکھایا ہے۔

ڈاکٹر اعجاز فاروق اکرم، فیصل آباد

مجلہ فکر و نظر پر تبصرے ("کتاب نما" ستمبر ۱۹۹۹) میں، میرے مقالے میں تبصرہ نگار نے بعض اہم تراجم اور تفاسیر کا ذکر نہ ہونے کی طرف توجہ دلائی ہے۔ میری اہل علم سے گزارش ہے کہ اس حوالے سے ان کے پاس مصدقہ معلومات ہوں تو مجھے مطلع فرمائیں (شعبہ عربی، گورنمنٹ کالج، فیصل آباد)۔

تنویر احمد بٹ، کراچی

فیصلے کی گھڑی (ستمبر ۱۹۹۹) میں کچھ تجاویز کا تذکرہ ہے جو بنیادی اہمیت کی حامل ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ متبادل قیادت اور نظام کے بارے میں غور و فکر کی تحریک چلائی جائے اور تمام مسائل پر مفصل لائحہ عمل تیار کیا جائے۔ جو تصورات موجود

نصاریٰ اور ہنود کی گھناؤنی سازشوں نے پختہ کر دیے ہیں ان کی تطہیر اور تشکیل نو کے لیے جہادی بنیادوں پر کام کیا جائے۔ "اخبار امت" کے ساتھ کچھ صفحات "اخبار وطن" کے لیے بھی مختص کیے جائیں۔ ایسا لٹریچر شائع ہو رہا ہے جو نئے ذہن کو برگشتہ کرتا ہے اور اسلام کے بارے میں شکوک و شبہات ابھارتا ہے۔ اس کے لیے باقاعدہ ادارے قائم ہیں۔ ان کا تعاقب کیا جانا چاہیے۔ دشمن تیزی سے اور منظم انداز سے کام کر رہا ہے' ان کی چالوں کو سمجھنا اور ان کا توڑ کرنا چاہیے۔

محمد یوسف' جبیل' سعودی عرب

فیصلے کی گھڑی (اشارات' ستمبر ۱۹۹۹) میں قوم کی موجودہ حالت اور جماعت کی پالیسی کی بڑی اچھی وضاحت کی گئی۔ میں ذاتی طور پر ویب سائٹ سے اشارات کا انگریزی ترجمہ حاصل کر کے اپنے کئی ایسے دوستوں کو دیتا ہوں جو صرف انگریزی میں ہی پڑھنا چاہتے ہیں۔

سلیم منصور خالد' گوجرانوالہ

جولائی ۹۹ کے شمارے میں "مشترکہ خاندانی نظام" پر ایک خاتون کو' جو جواب دیا گیا' اس پر' اسلام کے دین فطرت ہونے کے حوالے سے کچھ گزارشات ہیں:

اسلام بلاشبہ عدل و احسان اور صلہ رحمی کا حکم دیتا ہے' مگر اس کے ساتھ فرد کے حقوق کو بھی تحفظ عطا کرتا ہے' خصوصاً عائلی زندگی کو تو تحفظ دینے کے معاملے میں بہت حساس ہے۔ ایک خاتون' جو دین اسلام سے محبت رکھتی ہے' اس پر عمل کرنے کی کوشش کرتی ہے' لڑاکی اور جھگڑالو نہیں' بلکہ صلہ رحمی کے اصولوں کے مطابق رہنمائی کی خواستگار ہے' وہ دریافت کرتی ہے کہ "میرے شوہر کے تینوں بھائی برسرروزگار ہیں۔ اس مشترکہ خاندانی نظام میں کیا الگ گھر کے لیے میرا مطالبہ جائز نہیں ہے۔ شرعاً میرے شوہر کو کیا کرنا چاہیے"۔ آپ اس پر یہ فتویٰ صادر کر رہے ہیں کہ "اپنے شوہر کو مزید موقع دیں کہ وہ اپنے بھائیوں کو اپنے پاؤں پر کھڑا کرنے کے بعد مکمل الگ رہائش اختیار کرنے کی پوزیشن میں آ جائیں..... الگ رہائش..... میں تنہائی کا احساس بھی ہوتا ہے اور باہمی تعاون حاصل کرنے سے [فرد] محروم بھی ہو جاتا ہے (ص ۷۱)۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ آج جس مشترکہ خاندانی نظام کو بے جا طور پر "اسلامی خاندانی نظام" بنا کر لوگوں کے سر پر تھوپا جا رہا ہے' اس مبالغہ آمیز حد تک اس کا اسلام میں کوئی تصور نہیں بلکہ یہ یہاں کے زرعی اور ہندوانہ پس منظر کا حامل ایک رواج ہے (دیکھیے "مشترکہ خاندانی نظام اور اسلام" از سلطان احمد اصلاحی' اسلامک پبلی کیشنز)۔ دوسری بات یہ ہے کہ وہ جوان افراد جن میں سے ایک سعودی عرب میں ملازم ہے' دوسرا ہومیو ڈاکٹر ہے اور تیسرا محکمہ جنگلات میں ملازم ہے (ص ۹۹' ایضاً) آپ انھیں بھی نابالغ قسم کے بے کار بھائیوں پر محمول کر کے' بے چاری عورت کو اس کے جائز حقوق سے دست بردار ہونے کا مشورہ دے رہے ہیں۔ حالانکہ خود جہاں تک ساس' سسر کا تعلق ہے' ان کے بارے میں بھی بنیادی ذمہ داری ان کے بیٹے کی ہوتی ہے' بہو تو جو کچھ کرتی ہے وہ صلہ رحمی اور احسان ہے' مگر آج تو بہو کو بھی سسرال والے ایک لونڈی کی طرح رگڑا دینا اپنا "اسلامی" حق جانتے ہیں۔ اس باب میں ہمارا معاشرہ عجیب دورنگی کا شکار ہے۔ لوگ اپنی بیاہتا بیٹی کے لیے جن حقوق کے طلب گار ہوتے ہیں ان کے برعکس اپنی بہو کو انھی حقوق سے محروم رکھنے کو اپنا اسلامی حق قرار دے ڈالتے ہیں۔

میری گزارش ہے' ہندی تہذیب کے جبری سماجی نظام کو مبالغہ آمیز حد تک' اسلامی بنا کر ٹھونسنے کی بجائے' اسلام کی واضح رہنمائی دی جائے۔ ایک عورت کے جائز حقوق اور تحفظات کے سلسلے میں اسے جو رعائتیں میسر ہیں' ان سے فیض یاب ہونے دیں' محض چند فقہا کے فتووں کے بوجھ تلے عائلی نظام کو یوں نہ کچل دیں' کہ خود دین فطرت ہونے کے حوالے سے رد عمل پیدا ہو۔ اگر ایسا ہوتا ہے تو اس کی ذمہ داری قرآن و سنت پر نہیں' بلکہ اپنے اپنے معاشروں اور سماجی ڈھانچوں کے اسیر فقہا پر آئے گی مگر فرد کی گمراہی کا راستہ رک نہ سکے گا۔

ڈاکٹر محمد عثمان خاں' دوحہ' قطر

الحمدللہ' ۱۹۶۰ یعنی ۴۰ سال سے آپ کا رسالہ پڑھ رہا ہوں۔ مضمون نگاروں کی اتنی تفصیل ہونا چاہیے کہ قاری ان سے براہ راست رابطہ کر سکے۔ طویل مدت سے کوئی خاص نمبر نہیں آیا ہے' پیاس محسوس ہوتی ہے۔ اگلے شمارے کی جھلک بھی دی جائے۔ شمارہ ویب سائٹ پر فراہم کیا جائے۔

ڈاکٹر عنایت اللہ فیضی' چترال

اشارات میں پند و موعظت کے خطیبانہ انداز کے بجائے آگہی اور ابلاغ کے جارحانہ تحریری اسلوب کی پیروی ہونا چاہیے۔ خیرالکلام ماقل و دل کا خیال رکھنا چاہیے۔ اس طرح مقصد زیادہ بہتر طور پر حاصل ہو گا۔

فہیم الدین احمد' کریم نگر' بھارت

' اشارات ترجمان القرآن کی روح ہیں' اگرچہ موضوعات میں تنوع کی کمی کھٹکتی ہے۔ تقریباً تمام ہی مضامین مفید اور معلومات سے پر ہوتے ہیں۔ "رسائل و مسائل" کو اور زیادہ جان دار ہونا چاہیے۔

محمد رشید' القصیم' سعودی عرب

بہت سارے ساتھیوں کو اس حق کے ترجمان اور علم کے خزانے یعنی ترجمان القرآن کا قاری بنایا ہے۔ ہر مجلہ پہلے سے زیادہ قیمتی ہوتا ہے۔ اشارات اپنی مثل آپ ہوتے ہیں۔

حامد عبدالرحمن الکاف' صنعا' یمن

عبدالعزیز ساحر نے ابن تیمیہ" اور علامہ اقبال" کے حوالے سے ابن عربی اور وحدت الوجود اور تصوف کے بارے میں جو کچھ بھی کہا ہے (کتاب نما' ستمبر ۱۹۹۹) اس کے بارے میں یہ عرض کرنا ہے کہ میرے نزدیک شریعت جو عقائد' عبادات' معاملات' احکام اور تزکیہ نفس و اخلاق' غرض ہر چیز سے عبارت اور ہر چیز پر مشتمل ہے' کا وجود کسی اور طریقت / طریقہ / طریق سے مستغنی کرنے کا حقیقی سبب ہے۔ کیونکہ کسی اور طریقت / طریقہ / طریق کی ضرورت کا احساس اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ خاتم بدہن کتاب و سنت میں تزکیہ نفس اور تحسین اخلاق کے اصول اور نظم میں کمی اور نقص ہے اور ان کو پورا کرنے کے لیے غیر موحٰی الیہم بشر (ایسے آدمی جن کی طرف وحی نہیں کی جاتی ہے) کو کچھ عقائد' نظریات اور اعمال "ایجاد" کرنے اور "اضافہ" کرنے کی ضرورت ہے۔ شریعت' ہر طرح اور ہر پہلو اور ہر زاویے سے اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری نبیؐ کے ذریعے مکمل فرما دی ہے۔ اب کسی زیادت یا زوائد کی قطعاً ضرورت نہیں ہے۔ اس لیے اس پر کلام بھی ناقابل تحمل ہے۔ لیکن خیال رہے کہ اجتہاد شریعت میں اضافہ یا زیادتی نہیں ہے بلکہ دائرہ شریعت میں رہ کر اور اس کی روشنی میں نت نئے مسائل کا حل تلاش کرنے کی کوشش ہے۔ اس طرح اجتہاد شریعت ہی کا ایک جز ہے اور اس کے دائمی ہونے اور اس کو دائمی رکھنے کا ایک آلہ اور ذریعہ ہے۔


13 رہائشی منصوبوں کی شاندار کامیابی کا حامل اور آپکے کامل اعتماد کا مظہر
احباب گروپ آف کمپنیز
پمفلٹ مفت منگوائیں
لاہور میں
اسلام آباد میں
(اسلام آباد سے متصل مرگلہ ہلز کے حسین دامن میں ایک نیا دلپذیر شہر)
منظر کوہسار
ہاؤسنگ اینڈ فزیکل پلاننگ حکومت پنجاب اور ڈسٹرکٹ کونسل راولپنڈی سے منظور شدہ سڑکیں سیوریج، بجلی، پانی سکول کمیونٹی سنٹر قبرستان، مسجد ہسپتال اور خوبصورت جھیل۔ ترقیاتی کام تیزی سے جاری ہے
شاداب کالونی
کشادہ سڑکیں خوبصورت پارکیں مسجد ڈسپنسری سکول مارکیٹیں ٹیلیفون اور سوئی گیس کی سہولت موجود سکول کالج اور بڑے ہسپتال قریب تر ترقیاتی کام آخری مراحل میں ہیں۔ کنال 500 مربع گز
گیلانی پارک
منصوبہ جو تقریباً پایہ تکمیل کو پہنچ چکا ہے۔ بجلی لگ چکی ہے۔ شاداب کالونی تمام سہولیات کیساتھ صرف 5 مرلہ اور 10 مرلہ پلاٹس برائے بکنگ
قیمت و طریقہ ادائیگی
احباب ہاؤسنگ سوسائٹی پرائیویٹ لمیٹڈ
1-A فیض روڈ اولڈ مسلم ٹاؤن لاہور فون 5869549-5865371 فیکس 5837016
E-mail: ahbab@nexlinx.net.pk

زخمی ،معذور اور بیمار مجاہدین ،مہاجرین کا ادارہ

کشمیر سرجیکل ہسپتال

زیر اہتمام :پاکستان اسلامک میڈیکل ایسوسی ایشن

- اکتوبر 1990 سے جون 1999ء تک 360000 ہزار مریضوں کا مفت اور مکمل علاج کیا گیا۔
- 1000 سے زائد افراد کو فراست بائٹ سے نجات دلا کر معذور ہونے سے بچالیا گیا۔(الحمد للہ)
- تمام مہاجرین اور عسکری تنظیموں کے مجاہدین کا مکمل اور مفت علاج کیا جارہا ہے
- کشمیر سرجیکل ہسپتال کے تحت متحدہ جہاد کونسل میں شامل تمام تنظیموں کے کیمپوں 60 فرسٹ ایڈ سنٹر کام کررہے ہیں
- روزانہ 250 سے 350 مریضوں کو مفت طبی امداد فراہم کی جاتی ہے
- ہسپتال کے زیر اہتمام مہاجرین کے کیمپوں میں چار مستقل ڈسپنسریاں اور چار ایمبولینس گاڑیاں ہمہ وقت مصروف کار ہیں جبکہ کیمپوں میں چار نئی ڈسپنسریاں قائم کی جارہی ہیں۔
- مظفر آباد اور کوٹلی میں چار ایمبولنس گاڑیاں ہمہ وقت مصروف کار ہیں
- دو نئے وارڈ کی تعمیر جاری ہے
- معذور مجاہدین اور مہاجرین کو 800 سے زائد مصنوعی اعضاء لگائے گئے

کیا آپ کا بھی اس میں کوئی حصہ ہے




خوش نصیب ہے جو گھر بیٹھے

★ غزوہ ہند میں شریک ہے ★ اپنی ملت کی زخمی شہ رگ سے بہتے لہو پر مرہم رکھ رہا ہے ★ زخمی و معذور مجاہدین و مہاجرین کی خدمت اور عیادت کا ثواب حاصل کر رہا ہے ★ عظیم ملی فریضے کی ادائیگی کر رہا ہے




اور رسول ﷺ سے جنت کی بشارت پا رہا ہے (الحدیث) اور جو اس سے محروم ہے وہ یقیناً بہت ہی محروم ہے

آپ نقد عطیات کے علاوہ ادویات کی صورت میں بھی مدد کر سکتے ہیں




اکاؤنٹ نمبر 1128
بنک آف پنجاب
مظفر آباد آزاد کشمیر

تعاون کے لیے

ڈاکٹر محمود حسین کیانی (میڈیکل سپرنٹنڈنٹ)

کشمیر سرجیکل ہسپتال پولٹری فارم روڈ مظفر آباد آزاد جموں کشمیر

فون 058810-3700

C .P.L. 236

Phone : 7587916
7585590

Monthly **TARJUMAN-UL-QURAN** LAHORE,